© rasailojaraid.com

التفسیر، مجلس تفسیر، کراچی جلد ۶، شمارہ ۱۸، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ء

داعی قرآن: ڈاکٹر اسرار احمد

عبدالرحمن خان

ڈاکٹر اسرار احمدؒ عظیم داعی قرآن تھے، انہوں نے قرآن حکیم کے علم و حکمت کی وسیع پیمانے اور اعلیٰ سطح پر تبلیغ کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کردی تاکہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی راہ ہموار ہو سکے۔ آپ نے قرآن کی درس و تدریس کے لیے تمام قدیم و جدید وسائل استعمال کیے۔ نظام خلافت کے قیام کی جدوجہد کے لیے ۱۹۷۵ء میں ''تنظیم اسلامی'' قائم کی جس کی قرارداد تاسیس میں ڈاکٹر صاحبؒ فرماتے ہیں:

> ''آج ہم اللہ کا نام لے کر ایک ایسی اسلامی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کرتے ہیں جو دین کی جانب سے عائد کردہ جملہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ہماری ممد و معاون ہو۔
>
> ہمارے نزدیک دین کا اصل مخاطب فرد ہے۔ اُسی کی اخلاقی و روحانی تکمیل اور فلاح و نجات، دین کا اصل موضوع ہے اور پیش نظر اجتماعیت اصلاً اسی لئے مطلوب ہے کہ وہ فرد کو اس کے نصب العین یعنی رضائے الٰہی کے حصول میں مدد دے۔
>
> لہٰذا پیش نظر اجتماعیت کی نوعیت ایسی ہونی چاہیے کہ اُس میں فرد کی دینی اور اخلاقی تربیت کا کماحقہٗ لحاظ رکھا جائے اور اس امر کا خصوصی اہتمام کیا جائے کہ اس کے تمام شرکاء کے دینی جذبات کو جلا حاصل ہو، ان کے علم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے، ان کے عقائد کی تصحیح و تطہیر ہو، عبادت اور اتباع سنت سے اُن کا شغف اور ذوق و شوق بڑھتا چلا جائے، عملی زندگی میں حلال و حرام کے بارے میں اُن کی حس تیز تر اور اُن کا عمل زیادہ سے زیادہ مبنی بر تقویٰ ہوتا چلا جائے اور دین کی دعوت و اشاعت اور اس کی نصرت و اقامت کے لئے اُن کا جذبہ ترقی کرتا چلا جائے۔ ان تمام اُمور کے لئے ذہنی اور علمی رہنمائی کے ساتھ ساتھ عملی تربیت اور تاثیر صحبت کے اہتمام کی جانب خصوصی توجہ ناگزیر ہے۔
>
> دعوت دین کے ضمن میں ہمارے نزدیک ''الدین النصیحۃ'' کی روح اور ''الاقرب فالاقرب'' کی تدریج ضروری ہے۔ لہٰذا دعوت و اصلاح کے عمل کو فرد سے اوّلاً کنبہ اور خاندان اور پھر تدریجاً ماحول کی جانب بڑھانا چاہیے۔ اس ضمن میں نئی نسل کی دینی تعلیم و تربیت کا خصوصی اہتمام ناگزیر ہے۔
>
> عامۃ الناس کو دین کی دعوت و تبلیغ کی جو ذمہ داری امت مسلمہ پر بحیثیت مجموعی عائد ہوتی ہے اس کے ضمن میں ہمارے نزدیک اہم ترین کام یہ ہے کہ جاہلیت قدیمہ کے باطل عقائد و رسوم اور دور جدید کے گمراہ کن افکار و نظریات کا مدلل ابطال کیا جائے اور حیات انسانی کے مختلف پہلوؤں کے لئے کتاب و سنت کی ہدایت و رہنمائی کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے، تاکہ ان کی اصلی حکمت اور عقلی قدر و قیمت واضح ہو اور وہ شبہات و شکوک رفع ہوں جو اس دور کے لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہیں''۔ (۱)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈاکٹر صاحب کی زندگی کو ہم تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں:

پہلا دور: پیدائش اور تعلیم

ڈاکٹر صاحبؒ ۲۶ اپریل ۱۹۳۲ء کو مشرقی پنجاب کے ایک قصبہ حصار میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے آباء و اجداد کا تعلق یوپی ہندوستان کے علاقے مظفر نگر سے تھا۔ ۱۸۵۷ء میں آپ کے دادا اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے مشرقی پنجاب آ گئے۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو علامہ اقبال کی شاعری سے خصوصی شغف تھا اسی لیے بچپن ہی میں ان کی اردو شاعری کے پہلے مجموعہ 'بانگِ درا' کا مطالعہ کر لیا تھا۔ خصوصاً 'طلوعِ اسلام' کے یہ اشعار تو انہیں بے حد پسند تھے:

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے؟
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!!
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا
سبق پھر پڑھ صداقت کا شجاعت کا عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا"(۲)

۴۷-۱۹۴۶ء میں جب تقسیم ہند کا معاملہ خوب زوروں پر تھا، اور مسلمانانِ برصغیر نظریاتی اعتبار سے تین دائروں میں تقسیم تھے۔ جماعتِ اسلامی کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اولاً ہمارا مقصد مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ نہیں بلکہ اسلام کا نفاذ ہونا چاہیے۔ ہم مسلمانوں اور غیر مسلموں کے سامنے دینِ اسلام کی دعوت اور اس کے عملی تقاضے رکھیں۔ جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں اب ان کو منظم کر کے اسلام کے عادلانہ نظام کے لیے بھرپور کوششیں کی جائیں۔ اگر اسلام کا

عادلانہ نظام بالفعل قائم ہو گیا تو اس کی برکات ہم دنیا میں بھی محسوس کریں گے اور آخرت کی تیاری کے لیے ایک سازگار ماحول مل سکے گا۔ دوسری سوچ جمعیت علمائے ہند کی تھی کہ ہماری اولین ترجیح ہندوستان کو برطانوی استعمار سے آزاد کرانا ہے۔ اس کے لیے اگر ہمیں ہندوؤں سے بھی اتحاد کرنا پڑے تو کر لینا چاہیے۔ استعمار سے آزادی کے بعد ہم شریعتِ اسلامی کے نفاذ کے لیے جدوجہد کریں گے۔ اور ہندوؤں نے اگر ہماری اس جدوجہد میں روڑے اٹکانے کی کوشش کی تو ہم اُن کا مقابلہ کریں گے چونکہ ہم اُن پر کئی سو سال حکومت کر چکے ہیں۔ تیسری سوچ مسلم لیگ کی تھی کہ استعماری اقتدار کے خاتمہ کے بعد ہم ہندو قوم کے ظلم و ستم کا شکار ہو جائیں گے کیونکہ ہمیں بار بار اُن کی مسلم دشمنی اور تعصب کا تجربہ ہو چکا ہے۔ ہمیں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے علیحدہ ملک بنانا ہو گا۔ تاکہ ہم اس ملک میں اسلام کا عادلانہ نظام قائم کر کے پوری دنیا کو اس کی برکات کا عملی نمونہ دکھا سکیں، تاکہ ان پر حجت تمام ہو سکے۔

ان مختلف الخیال آراء کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب بنیادی طور پر جماعت اسلامی کے نقطۂ نظر سے متفق تھے۔ لیکن ان کے خیال میں ہمیں علیحدہ ملک حاصل کر کے جماعت کے نہج پر کام کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب نے جمعیت علماء ہند کے نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں کیا لیکن ان کے تقویٰ اور خلوص کے معترف رہے، لیکن چونکہ وہ دیکھ رہے تھے انگریزوں کی سرپرستی سے اب ہندو زندگی کے ہر شعبے میں بہت ترقی کر چکے تھے اور اُن کے اندر مسلمانوں سے اپنی ہزار سالہ شکست کا انتقام لینے کا جذبہ بھی انگڑائیاں لے رہا تھا۔ لیکن جمعیت علماء ہند کو اس کا اندازہ نہیں تھا کہ عوام مسلسل مختلف معاملات میں ہندو تعصب کا سامنا کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عوام نے ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کے موقف کی تائید کی اور مسلم لیگ کو بھاری اکثریت سے کامیابی دلائی۔ ڈاکٹر صاحب نے تحریکِ پاکستان میں بھرپور حصہ لیا اور فعال کردار ادا کیا۔ وہ ضلع حصار میں مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری رہے۔ اسی حیثیت سے وہ حصار سے لاہور آنے والے وفد میں شامل تھے جو قائد اعظم سے ملاقات کے لیے آیا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۴۷ء میں میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ اس دوران جماعت اسلامی کے دعوتی لٹریچر، کتب و رسائل کا مطالعہ کرتے رہے۔ پھر جب تقسیم ہند کے وقت فسادات شروع ہوئے تو حفاظتی کیمپوں میں جماعت اسلامی کے رسالہ ماہنامہ "ترجمان القرآن" میں شائع ہونے والے "تفہیم القرآن" کے حواشی کا مطالعہ کیا۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں:

> "اکتوبر ۱۹۴۷ء کے اوائل میں انڈین ملٹری نے حصار میں ہماری قلعہ بندیاں زبردستی توڑ ڈالیں اور پوری مسلمان آبادی کو ایک زیر تعمیر شدہ جیل کے احاطوں میں قائم شدہ کیمپ میں محبوس کر دیا۔ کچھ عرصہ وہاں قیام کے بعد ہم لوگ ایک پیدل قافلے کے ساتھ بیس روز میں ایک سو ستر میل کا فاصلہ طے کر کے اگر حافظہ غلطی نہیں کر رہا تو غالباً ۷ نومبر ۱۹۴۷ء کو براستہ سلیمانکی ہیڈ ورکس پاکستان میں داخل ہوئے اور اس طرح زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا!"۔(۳)

دوسرا دور: جماعت اسلامی کے ساتھ فکری و عملی وابستگی

پاکستان آمد کے بعد ۴۹-۱۹۴۸ء میں ڈاکٹر صاحب نے گورنمنٹ کالج لاہور میں ایف ایس سی میں داخلہ لیا۔ اُس وقت آپ نے حلقہ ہمدردان جماعت اسلامی اسلام پورہ، لاہور میں شامل ہو کر بڑی مستعدی کے ساتھ کام کیا، جماعت اسلامی کے لٹریچر کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ جماعت اسلامی کی نفاذ دستور اسلامی مہم میں بھرپور حصہ لیا۔ جس کے نتیجے میں مارچ ۱۹۴۹ء میں قرارداد مقاصد کو دستور پاکستان میں شامل کیا گیا۔ جس کے مطابق یہ طے پایا کہ پاکستان میں کوئی قانون سازی قرآن وسنت کے منافی نہ ہوگی۔

۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۴ء تک ڈاکٹر صاحب نے کنگ ایڈ ورڈ میڈیکل کالج لاہور سے MBBS کیا اس دوران باقاعدہ اسلامی جمعیت طلبہ میں شمولیت اختیار کر لی۔ جمعیت کے پلیٹ فارم نے آپ کی تقریری، تحریری اور تدریسی صلاحیتوں کو خوب نکھرنے کا موقع فراہم کیا۔ اسلامی جمعیت طلبہ سے وابستگی کے دوران آپ نے مختلف دعوتی مضامین تحریر کیے۔ جمعیت کے ترجمان کے طور پر ایک رسالہ "عزم" کے نام سے جاری کیا۔ لاہور کے علاوہ ساہیوال جا کر بھی

درس قرآن دیتے رہے فکر قرآنی کے حوالے سے آپ شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ سے بے حد متاثر تھے اسی لیے آپ تفسیر عثمانیؒ سے خاصا استفادہ کرتے تھے اور اس تفسیر کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ اس سے مجھے اسلاف کی خوشبو آرہی ہے۔ بلکہ وہ تنظیم اسلامی کو جماعت شیخ الہند ہی کی توسیع قرار دیتے تھے۔ شیخ الہندؒ کے بارے میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

> "میں حضرت شیخ الہند محمود الحسن دیوبندیؒ کو چودھویں صدی کا مجدد مانتا ہوں۔"(۴)

اس کے ساتھ ساتھ مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی تفسیر تدبر قرآنؒ سے بھی استفادہ کرتے تھے اور انہیں اصلاحی صاحب سے باقاعدہ شرف تلمذ بھی حاصل ہے۔ فکر قرآنی کی ان مختلف جہات کا احاطہ کرنے کی وجہ سے آپ کا درس قرآن بہت مقبول ہوا۔ جمعیت میں فعال سرگرمیوں کی وجہ سے پہلے ناظم لاہور پھر ناظم پنجاب اور ۵۴-۱۹۵۳ء میں ناظم اعلیٰ پاکستان رہے۔

اس دوران ڈاکٹر صاحب نے کئی تربیت گاہوں کا انعقاد کروایا۔ ان تربیت گاہوں میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحبؒ کے دروس قرآن سے خوب استفادہ کرتے رہے اس دوران تعطیلات کے زمانے میں منٹگمری (حال ساہیوال) میں جماعت اسلامی کے اجتماعات میں درس قرآن دیتے تھے۔ اس بارے میں فرماتے ہیں:

> "قرآن حکیم کے ساتھ اس تعلق کا سب سے بڑا فائدہ جو مجھے پہنچا وہ یہ کہ دین کی اساسی تعلیمات بھی مجھ پر براہِ راست قرآن حکیم کی روشنی میں واضح ہو گئیں اور خاص طور پر دعوت و تبلیغ دین کی اہمیت اور شہادت حق اور اقامت دین کی فرضیت بھی مجھ پر ازروئے قرآن منکشف ہو گئی۔ گویا ﴿فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ﴾ (البقرۃ:۲۵۶) کے مصداق میرے دینی فکر کا ایک براہِ راست تعلق قرآن حکیم سے قائم ہو گیا۔"(۵)

دورِ طالب علمی کے بعد ڈاکٹر صاحب نے جماعت اسلامی کی رکنیت کی درخواست دی۔ نومبر ۱۹۵۴ء میں اُن کی درخواست منظور ہوئی اور وہ باقاعدہ جماعت اسلامی کے رکن بن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گئے۔ چوں کہ آپ اپنی تعلیم مکمل کر چکے تھے اس لیے آپ ساہیوال منتقل ہو گئے اور وہاں جماعت اسلامی کی ایک ڈسپنسری میں ملازمت اختیار کی۔ کچھ ہی عرصہ بعد آپ کو جماعت اسلامی منٹگمری (حال ساہیوال) کا امیر بنا دیا گیا۔

۱۹۵۵ء میں جماعت اسلامی میں ایک بحران کی کیفیت پیدا ہونی شروع ہوئی۔ کئی اراکین جماعت نے محسوس کیا کہ جماعت اپنے نہج سے اعراض کی راہ پر گامزن ہو رہی ہے۔ اب فردی اصلاح کے بجائے زیادہ زور انتخابی سیاست کے ذریعے حکومتی تبدیلی پر ہے۔ جس کی وجہ سے اراکین جماعت کی تربیت کا معیار گرتا جا رہا ہے۔ جب جماعت کے سینئر ارکان کی طرف سے اس حوالے سے بے چینی بڑھنے لگی تو امیر جماعت سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے مولانا عبدالرحیم اشرفؒ، شیخ سلطان احمد اور مولانا عبدالغفار حسن پر مشتمل ایک جائزہ کمیٹی بنائی۔ کمیٹی کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ پورے ملک کا سروے کرے اور اراکین جماعت کے احساسات پر مشتمل ایک جائزہ رپورٹ پیش کرے۔

۱۹۵۶ء ڈاکٹر صاحب نے بھی ۲۵۰ صفحات پر مشتمل ایک بیان اس کمیٹی کے حوالے کیا۔ جو ۱۹۵۹ء میں "تحریک جماعت اسلامی ایک تحقیقی مطالعہ" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب کا تجزیہ یہ تھا کہ جماعت اسلامی جو کہ خالص اصولی اسلامی تحریک تھی اب قومی جماعت بن کے رہ گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"جس طرح دور اول کی جماعت اسلامی کی خصوصیات اول و دوم نے اسے بالکل "اصولی اسلامی تحریک" کی حیثیت دی تھی اسی طرح دور ثانی کی مندرجہ بالا خصوصیات اول و دوم نے اس دور کی جماعت کو بالکل "قومی جماعت" کی سطح پر لا کھڑا کر دیا۔ وہی لفظ قوم پہلے اس لیے متروک ہو گیا تھا کہ چاہے اپنی اصل کے اعتبار سے اس میں فی الواقع کوئی قباحت نہ ہو لیکن اس کے ساتھ عرصہ دراز کے استعمال سے غیر اسلامی تصورات لازماً وابستہ ہو گئے تھے۔"(۶)

ڈاکٹر صاحب نے اس تجزیہ کے لیے بطور دلیل جماعت کے اکابرین کی تحریروں کا

ایک تقابلی جائزہ پیش کیا۔ یہ تقابل ۱۹۴۷ء سے قبل لکھی جانے والی تحریروں اور پھر ۱۹۴۷ء کے بعد کی شائع ہونے والی تحریروں کا تھا۔ جس میں واضح تفاوت دکھائی دے رہا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کے اس اختلافی بیان نے جماعت اسلامی کی شوریٰ کے کئی اراکین کو بہت متاثر کیا۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحبؒ کا تاثر یہ تھا کہ اس نوجوان نے ہمیں ہماری تحریروں کی صورت میں ایک آئینہ دکھا دیا ہے۔ اراکین شوریٰ کی اکثریت کی رائے تھی کہ جماعت کو انتخابی سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ جبکہ مولانا مودودیؒ اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ اس کے لیے انہوں نے جماعت کی امارت سے مستعفی ہونا چاہا۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحبؒ کا موقف تھا کہ جماعت کے فطری امیر مولانا مودودیؒ ہیں اور جماعت صرف اُن کی امارت ہی میں کام کر سکتی ہے۔ البتہ مولانا مودودیؒ کو شوریٰ کی اکثریت کی رائے پر عمل کرنا چاہیے۔ جب کہ مولانا مودودیؒ اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ امیر جماعت شوریٰ کی اکثریت کی رائے کا پابند ہو۔ اس دوران مولانا مودودیؒ نے بڑی دلچسپ بات کہی کہ آپ چاہتے ہیں کہ امامت تو میں کروں لیکن رکوع اس وقت کروں جب شوریٰ اللہ اکبر کہے اور رکوع سے اُس وقت اٹھوں جب شوریٰ سمع اللہ لمن حمدہ کہے۔ امیر کو اراکین کو گنتا نہیں تولنا چاہیے۔ بہر حال نتیجہ یہ نکلا کہ اراکین شوریٰ کی اکثریت نے انتخابی سیاست میں حصہ لینے پر اختلاف کی وجہ سے جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ جب کہ ڈاکٹر صاحب نے جماعت سے علیحدگی کچھ عرصہ بعد اختیار کی۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ جماعت میں اظہار اختلاف رائے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ جس کو بھی جماعت کی پالیسی سے اختلاف ہے وہ اسے صرف سالانہ اجلاس میں ہی بیان کرے گا۔ ڈاکٹر صاحب اس پابندی کو درست نہیں سمجھتے تھے لہٰذا اُنہوں نے اپریل ۱۹۵۷ء میں جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ لیکن وہ فرماتے ہیں کہ:

"اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ میں نے زندگی کا وہ نصب العین بھی ترک کر دیا جس کے حصول کے لیے میں نے جماعت میں شمولیت اختیار کی تھی اور احیائے اسلام و تجدید دین اور شہادت حق و اقامت دین کی اس جدوجہد سے بھی لاتعلقی اختیار کر لی جسے میں نے پورے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شعور و ادراک کے ساتھ اپنا دینی فرض سمجھ کر قبول کیا تھا"۔(۷)

تیسرا دور: نئی اجتماعیت کے قیام کیلئے جدوجہد

جماعتِ اسلامی سے مستعفی ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحبؒ نے جماعت کی ڈسپنسری کی ملازمت چھوڑ دی اور ساہیوال میں اپنا مطب قائم کر لیا۔ ۶۱ء ۱۹۶۲ء میں دینی سرگرمیوں کے اعتبار سے ڈاکٹر صاحبؒ نے دروسِ قرآن کے کئی حلقے قائم کیے۔ اور منٹگمری (حال ساہیوال) میں طلبہ کے لیے ایک ہاسٹل بنایا تاکہ وہاں مقیم طلبہ کی دین کے وسیع تصور کے اعتبار سے ذہن سازی کی جا سکے۔ اس دوران جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہونے والے اکابرین سے بدستور رابطے کرتے رہے تاکہ ایک نئی اجتماعیت قائم کی جا سکے جو جماعت اسلامی کے ابتدائی طریقۂ کار کو پھر سے اختیار کر کے افراد کی ذہن سازی اور عملی تربیت کا اہتمام کر سکے۔ منٹگمری (حال ساہیوال) میں قیام کے دوران تقریباً دو سال تک تبلیغی جماعت کے ساتھ وابستہ رہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ عشاء جمعہ کے بیان میں شرکت کرتے اور فجر کے بعد تبلیغی جماعت کے اجتماع میں دروسِ قرآن دیتے رہے۔ لیکن چوں کہ تبلیغی جماعت کی اصل توجہ صرف افراد کی اصلاح پر ہے اور وہ نفاذِ شریعت کا کوئی واضح لائحہ عمل پیش نہیں کر رہی تو تبلیغی جماعت سے مزید منسلک نہ رہ سکے۔ ۱۹۶۳ء میں ڈاکٹر صاحب بڑے بھائی کی خواہش پر کراچی تشریف لائے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

> "اوائل ۶۳ء میں بڑے بھائی صاحب کی طرف سے دین اور دنیا یعنی معاش اور معاد دونوں کے لیے مشترکہ کوشش کی ایک نہایت دل آویز اور خوش آئند تجویز کے تحت کراچی منتقل ہو گیا اور اگرچہ بہت جلد محسوس ہو گیا کہ یہ بھی "دامِ ہمرنگ زمیں" ہی ہے تاہم ایک دفعہ اس میں گرفتار ہونے کے بعد کم و بیش تین سال اس سے رہائی حاصل کرنے میں لگے اور ۶۵ء میں میں واپس ساہیوال آ سکا۔"(۸)

کراچی میں قیام کے دوران ڈاکٹر صاحبؒ کی رہائش کچھ عرصہ کے لیے کورنگی میں دارالعلوم کراچی کے بالکل ساتھ انگلینڈ لمیٹڈ کی فیکٹری میں رہی۔ اس دوران ڈاکٹر صاحبؒ کو

مفتی شفیع صاحبؒ کی قربت بھی حاصل رہی۔ کراچی میں قیام کے دوران ڈاکٹر صاحبؒ نے دروسِ قرآن کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر صاحب نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے (اسلامک سٹڈیز) میں فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ کراچی سے واپس ساہیوال منتقلی کے بعد آپ کے والد صاحب ۱۱ نومبر ۶۵ء کو انتقال فرما گئے۔ اب ڈاکٹر صاحب ساہیوال سے لاہور منتقل ہو گئے اور لاہور کو اپنی دینی سرگرمیوں کا مرکز بنانے کا فیصلہ کیا۔ لاہور میں ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنی اب تک کی جمع شدہ پونجی سے کرشن نگر میں ایک مکان خریدا۔ اس مکان میں اپنا مطب قائم کیا۔ ۱۹۶۶ء میں دعوتی کتب کی اشاعت کے لیے دارالاشاعتِ الاسلامیہ قائم کیا۔ دارالاشاعت سے ڈاکٹر صاحب نے کئی دعوتی کتب شائع کیں اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تفسیر تدبر قرآن کی اشاعت کا بھی آغاز کیا۔ لاہور میں آپ نے دروسِ قرآن کے کئی حلقے قائم کیے اور جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے اکابرین سے رابطوں میں تیزی پیدا کر دی تاکہ احیاءِ اسلام کے لیے ایک نئی اجتماعت قائم کی جا سکے۔ اسی دوران ڈاکٹر صاحبؒ نے ماہنامہ میثاق کا دوبارہ اجرا کیا جسے مولانا اصلاحی صاحب نے ۱۹۵۹ء میں جاری کیا تھا لیکن اب وہ مالی دشواریوں کی وجہ سے شائع نہیں ہو رہا تھا۔ اس دوران روزنامہ 'کوہستان' میں "تحریک جماعتِ اسلامی" پر ایک تبصرہ چھپا۔ جس میں اس بات پر خاص تنقید کی گئی کہ جن حضرات نے جماعت اسلامی کو موردِ الزام ٹھہرا کر کہ صحیح طریقہ کار پر قائم نہیں رہی، جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی انہوں نے نو دس سال گزرنے کے بعد بھی کوئی اجتماعی پلیٹ فارم نہیں بنایا جو اس نصب العین کو صحیح سمت لے کر آگے چلے، جو جماعت اسلامی کا ہے۔ چونکہ نصب العین میں تو کسی کا اختلاف نہیں۔ اس تنقید کا یہ اثر ہوا کہ ڈاکٹر صاحب اور دوسرے اکابرین جو جماعت سے علیحدہ ہوئے تھے، رابطوں میں تیزی لائے۔ اور جلد ایک اجتماعی نظم بنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ انہی کوششوں کے نتیجے میں ۶۷۔۱۹۶۶ء میں رحیم یار خان میں اجتماع ہوا۔ جس میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب، مولانا عبدالغفار حسن صاحب اور دیگر اکابرین نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں ایک اجتماعیت کے قیام کے حوالے سے قراردادِ تاسیس پر اتفاق ہوا۔ قراردادِ تاسیس کی توضیحات کے ضمن میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اور مولانا عبدالغفار حسن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صاحب نے بہت عمدہ تقاریر کیں۔ طے پایا کہ نئی اجتماعیت کے لیے کنوینر مولانا امین احسن اصلاحی صاحب ہوں گے۔ وہ پورے پاکستان کا دورہ کریں گے اور خدمتِ دین کا جذبہ رکھنے والوں کو نئی اجتماعیت کے مقاصد اور طریقۂ کار سے آگاہ کریں گے۔ بعد ازاں اس اجتماعیت میں شمولیت کا ارادہ کرنے والوں کا ایک ملک گیر اجتماع ہوگا جس میں اجتماعیت کے قیام کا باقاعدہ اعلان کیا جائے گا۔ پروگرام کے مطابق مولانا امین احسن اصلاحی صاحب مختلف شہروں کے دورے پر نکلے۔ سکھر میں ایک اجتماع کے دوران اُن کی جماعت اسلامی کے ایک رکن سے تلخ کلامی ہوگئی۔ اصلاحی صاحب اس پر دلبرداشتہ ہوگئے اور صاف کہہ دیا کہ یہ کام میرے بس کا نہیں۔ وہیں سے اُنہوں نے لاہور واپسی کا فیصلہ کیا۔لہٰذا ''حسرت اُن غنچوں پہ جو بن کھلے مرجھا گئے'' کے مصداق ایک اجتماعیت کے قیام کا معاملہ آگے نہ بڑھ سکا۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

> ''بہر حال اس مرحلے پر میں نے خوب سوچ سمجھ کر پوری دلجمعی کے ساتھ یہ فیصلہ کر لیا کہ اب جو کچھ کرنا ہے انفرادی طور پر اور از خود کرنا ہے۔ نہ بزرگوں کے انتظار میں رہنا ہے کہ وہ آگے بڑھیں تو میں بھی چلوں نہ سابق رفقاء کی راہ تکنی ہے کہ وہ ساتھ قدم ملائیں تو میں بھی سفر کا آغاز کروں۔ ہر شخص خدا کی عدالت میں انفرادی طور پر پیش ہوگا اور اپنی اپنی جوابدہی کرے گا۔ ﴿وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا﴾(مریم) لہٰذا کوئی اور آگے بڑھے یا نہ بڑھے اور ساتھ دے یا نہ دے' مجھے اپنی ذمہ داری کی ادائیگی کی فکر بہرحال کرنی ہے!''(۹)

بالآخر ان تھک جدوجہد کے بعد ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی کا قیام عمل میں آیا اور مذکورہ قرار دادِ تاسیس کو ہی اس نئی اجتماعیت کی اساس قرار دیا گیا۔ لیکن ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ جب اس بات سے ناامید ہوگئے تھے کہ جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہونے والے اکابرین کسی اجتماعیت کے قیام کے حوالے سے آگے بڑھیں گے تو اُنہوں نے اپنے طور پر ایک اجتماعی جدوجہد کے آغاز کا عزم کیا۔ اس حوالے سے ایک لائحۂ عمل ''اسلام کی نشاۃ ثانیہ --- کرنے کا اصل کام'' کے عنوان سے ایک تحریر میں پیش کیا۔ اس کتابچے میں اُنہوں نے واضح

کیا کہ مسلمانوں کے زوال کی بنیادی وجہ مغربی فکر کی ہمہ گیریت ہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

> ''خیالی اور ماورائی تصورات کے بجائے ٹھوس حقائق و واقعات کو غور و فکر اور سوچ و بچار کا اصل مرکز و محور ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔اور خدا کے بجائے کائنات' روح کے بجائے مادہ اور موت کے بعد کسی زندگی کے تصور کے بجائے حیاتِ دنیوی کو اصل موضوع بحث قرار دیا گیا ہے۔خالص علمی سطح پر تو اگرچہ یہ کہا گیا کہ ہم خدا ، روح اور حیات بعد الممات کا نہ اقرار کرتے ہیں نہ انکار لیکن اس عدمِ اقرار و انکار کا نتیجہ بہر حال یہ نکلا کہ یہ تصورات رفتہ رفتہ بالکل خارج از بحث ہوتے چلے گئے اور انسان کے سارے غور و فکر اور تحقیق و تجسس کا مرکز و محور کائنات ، مادہ اور حیاتِ دنیوی بن کر رہ گئے۔''(۱۰)

ان تصورات کی مدافعت کیلئے دارالعلوم دیوبند ایک تحریک کی شکل میں منظر عام پر آیا جنہوں نے اس دور میں روحانیت کی شمعیں جلائیں اور قال اللہ و قال الرسول کی صداؤں میں دینِ اسلام کا ڈھانچہ محفوظ رکھا۔دوسری قسم کی کوششوں کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ جدید فکر میں سے صحیح و غلط کی نشان دہی کر کے علیحدہ کیا جائے اور اسلام کی حقانیت ثابت کی جائے۔ڈاکٹر صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

> ''بہر حال امر واقعہ ہے کہ ان کی ان کوششوں سے دین و مذہب کی جان نکل کر رہ گئی اور مغرب کی مادہ پرستانہ ذہنیت کے تحت مذہب کا ایک کم و بیش لا مذہبی ایڈیشن تیار ہوا۔جس کا اگر کوئی فائدہ ہوا تو صرف یہ کہ بہت سے ایسے لوگوں کو جو ذہن و فکر کے اعتبار سے ہی نہیں تہذیب و تمدن کے لحاظ سے بھی خالص یورپین بن چکے تھے انہیں اپنے اوپر سے اسلام کا لیبل اتارنے کی ضرورت نہ پڑی۔اور وہ مسلم قومیت کے حلقے میں شامل رہ گئے اور دین کا یہ جدید ایڈیشن ان کی جانب سے مغرب کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خدمت میں بطور 'معذرت' پیش ہو گیا۔"(۱۱)

ڈاکٹر صاحبؒ کا تجزیہ یہ تھا کہ اب ان حالات میں احیاءِ اسلام کے لئے دو قسم کے کام کرنے ہوں گے۔ ایک علمی کام اور دوسرا تحریکی کام۔ علمی کام کے لئے ایسے نوجوان تیار کرنے ہوں گے جو ایک طرف جدید علوم سے بہرہ ور ہوں اور ساتھ ہی ساتھ اسلامی علوم کی ٹھوس بنیاد رکھتے ہوں۔ یہ نوجوان تخلیقی، تبلیغی، تدریسی اور تصنیفی کاموں کے ذریعے تین اعتبارات سے علمی خدمات سر انجام دیں۔ پہلا یہ کہ مغربی فلسفہ و فکر کی مضبوط دلائل سے تباہ کاریاں ثابت کریں۔ دوسرا یہ کہ اسلامی تعلیمات اور تصورات کو دلائل سے پیش کریں تاکہ جدید ذہن کے شبہات کا ازالہ ہو سکے۔ تیسرا یہ کہ عصرِ رواں کے اعتبار سے اسلام کے سیاسی معاشرتی اور معاشی نظام کو مرتب کریں جس سے ثابت ہو کہ اسلام ہی وہ واحد نظام ہے جو پوری دنیا کے اجتماعی مسائل کا حل پیش کرتا ہے یعنی اسلام کو ایک نظامِ حیات کے طور پر پیش کریں۔ تحریکی کام کے حوالے سے عوام الناس پر دینی ذمہ داریاں واضح کریں۔ انہیں ہر سطح پر یہ ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے منظم کریں۔ اُن کے دلوں میں نظامِ باطل کے خلاف شدید نفرت پیدا کریں تاکہ وہ رائج نظام کو ختم کرنے کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دیں۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے ان مقاصد کے حصول کے لیے پہلے اپنے آپ کو پیش کیا۔ علمی کام کے لیے ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور قائم کی جبکہ تحریکی کام کے لیے ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی قائم کی۔ اب ملک اور بیرون ملک سے باصلاحیت نوجوانوں کی تنظیم اسلامی سے وابستگی ہے جو اس مشن کو آگے پھیلا رہے ہیں۔

۱۹۶۷ء میں ڈاکٹر صاحبؒ نے "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" کے موضوع پر ایک معرکۃ الآرا تحریر لکھی۔ اس تحریر کے ذریعہ ڈاکٹر صاحب نے واضح کیا کہ مسلمانوں کے زوال کا اصل سبب قرآن مجید سے دوری ہے اور پھر سے عروج کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ قرآن مجید کے حقوق ادا کر کے اُس کے ساتھ اپنے تعلق کو زندہ اور مضبوط کیا جائے۔ ڈاکٹر صاحبؒ لکھتے ہیں:

"حالاتِ موجودہ یہ ایک بہت دور کی بات اور سہانا خواب معلوم ہوتا ہے

اس لئے کہ واقعی صورتِ حال یہ ہے کہ وہ امت کہ جسے قرآن کو اقوام و امم عالم تک پہنچانے کا ذمہ دار بنایا گیا تھا آج اس کی محتاج ہے کہ خود اسے قرآن "پہنچایا" جائے۔ لہٰذا اس وقت، اصل ضرورت اس کی ہے کہ خود امتِ مسلمہ میں تعلیم و تعلم قرآن کی ایک رو چل نکلے اور مسلمان درجہ بدرجہ قرآن سیکھنے اور سکھانے میں لگ جائے۔"(۱۲)

مذکورہ کتاب کو بہت پذیرائی ملی۔ اور لاکھوں کی تعداد میں تقسیم کی گئی۔ اس کتاب کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ اس کا انگریزی ترجمہ پروفیسر محمد ابراہیم مرحوم نے کیا۔ اور عربی ترجمہ ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والے ماہنامے 'البعث الاسلامی' میں شائع ہوا۔ اس کتاب پر جید علماء کی طرف سے ڈاکٹر صاحب کی خوب ستائش کی گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس بات کا متعدد بار اعتراف کیا کہ قرآن کی عظمت کا اولین نقش اقبال کی شاعری سے ہوا اور خاص طور پر اس شعر نے تو قلب و ذہن پر گہرے اثر چھوڑے، جس میں اقبالؒ فرماتے ہیں:

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

ڈاکٹر صاحب اکثر اس شعر میں 'تم' کی جگہ 'ہم' پڑھا کرتے تھے یعنی "اور 'ہم' خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر ۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۱ء کا دور ڈاکٹر صاحب کے لئے مشکلات کا دور رہا۔ اس لیے کہ بہت سی ذمہ داریاں بیک وقت ان کے کندھوں پر آ گئیں۔ مختلف جگہوں پر دروس قرآن کے حلقہ جات قائم تھے۔ اپنے مطب کو بھی باقاعدہ وقت دینا ہوتا تھا۔ پاکستان کے مختلف شہروں میں بغرض خطاب یا درس جانا ہوتا تھا۔ ماہنامہ 'میثاق' کی ادارت بھی ڈاکٹر صاحب کے پاس تھی۔ ساتھ ساتھ دارالاشاعت میں بھی خاصی مصروفیت رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کو شام کے وقت بخار رہتا تھا۔ اور صحت بدستور خراب ہو رہی تھی۔ شروع شروع میں تو اپنی صحت کی طرف دھیان نہ دیا، لیکن جب صحت زیادہ خراب ہوئی تو مجبوراً تشخیص کرانا پڑی۔ لیکن اس تشخیص کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا تو آپ نے کچھ دنوں کے لیے لاہور سے باہر جا کر آرام کیا۔ پھر واپس آ کر کام شروع کر دیا۔ لیکن صحت دوبارہ خراب ہونے لگی، تو کچھ دلبرداشتہ ہو کر اور بعض

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسرے عوامل کی وجہ سے آپ نے کچھ ماہ بیرون ملک جانے کا فیصلہ کیا۔

چنانچہ ڈاکٹر صاحب اواخر اکتوبر ۱۹۷۰ء میں حجاز مقدس کے لیے روانہ ہوگئے۔ ۱۳۹۰ھ کا رمضان المبارک کا پورا مہینہ مدینہ منورہ میں گزارا۔اس کے بعد ایک ماہ کے لیے لندن اپنے بھائی ڈاکٹر ابصار احمد صاحب کے پاس چلے گئے۔وہاں سے پھر حجاز آئے۔ اس دوران مسلسل اپنے مستقبل کے لائحہ عمل کے بارے میں سوچتے رہے۔ چنانچہ وہیں حجاز مقدس میں اپنی زندگی کا اہم فیصلہ کیا کہ اب پوری زندگی قرآن اور نظام خلافت کے قیام کے لیے وقف کرتا ہوں۔ مطب کو بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ مطب کے تمام اثاثہ جات فروخت کر دیے۔اس کے بعد آپ نے قرآن کی تعلیمات کو اعلیٰ علمی سطح پر پہنچانے کے لیے اواخر ۱۹۷۲ء میں 'مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' قائم کی۔ بعد میں دار الاشاعت الاسلامیہ کے تمام اثاثہ جات انجمن خدام القرآن نے خرید لئے جس سے ڈاکٹر صاحب کی مالی مشکلات میں کمی آئی۔ انجمن خدام القرآن کی طرف سے ڈاکٹر صاحب کو رہائش فراہم کی گئی۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنا کرشن نگر کا گھر کرائے پر دے دیا جس سے ڈاکٹر صاحبؒ کے گزر اوقات کی سبیل پیدا ہوگئی۔البتہ ڈاکٹر صاحبؒ نے طے کیا کہ ان کی مطبوعات پر اُن کا کوئی حق نہیں ہوگا اور اُن سے ہونے والی تمام آمدنی انجمن خدام القرآن کے لئے وقف ہوگی۔ اس انجمن کے تحت ۱۹۷۵ء میں ماڈل ٹاؤن لاہور میں قرآن اکیڈمی قائم ہوگئی۔ بلاشبہ یہ اکیڈمی خدمتِ قرآن کا ایک بہت بڑا مرکز ہے جس میں بیش بہا تدریسی،تبلیغی،تصنیفی اور تحقیقی کام جاری وساری ہیں۔ ڈاکٹر صاحبؒ لکھتے ہیں :۔

> "واضح رہے کہ راقم الحروف اپنی ذہنی ساخت اور مزاج وطبع کی افتاد کے اعتبار سے محض انجمن سازی پر نہ کبھی پہلے مطمئن ہو سکا ہے اور نہ اب مطمئن ہوسکتا ہے، بلکہ اس کے پیش نظر بحمداللہ اعلائے کلمۃ اللہ اور اظہار دین حق کا بلند و بالا نصب العین ہے اور اس کے لیے ایک ہمہ گیر جدوجہد ہی اس کی زندگی کا اصل مقصد ہے..... پھر یہ بات بھی اس پر بخوبی واضح ہے کہ یہ کام انجمنوں کے ذریعے نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے لیے لازم ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے ایک قول مبارک کے مطابق سمع وطاعت اور جہاد و ہجرت کی بنیادوں پر باقاعدہ ایک جماعت قائم کی جائے اور اسے امید واثق ہے کہ بفضلہ تعالیٰ اس کی زندگی میں یہ مرحلہ بھی ضرور آ کر رہے گا، تاہم ابھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا مناسب وقت کب آئے گا اور فی الوقت ان مقاصد عظیمہ کی اصل جدوجہد کی تمہید کے طور پر صرف تعلیم وتعلم قرآن کے جزوی کام پر اکتفا کیے ہوئے ہے اور پیش نظر انجمن کی حیثیت اس جزوی کام کے بھی ایک شعبے کی ہے۔ چنانچہ مجوزہ انجمن کی قرارداد تاسیس کے الفاظ سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ "منبع ایمان و یقین یعنی قرآن حکیم کے علم و حکمت کی وسیع پیمانے پر تشہیر و اشاعت" بجائے خود مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود یعنی "اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور غلبہ دین حق کے دورثانی" کی شرط لازم یعنی "تجدید ایمان کی عمومی تحریک" برپا کرنے کا ذریعہ اور وسیلہ ہے"(۱۳)

تنظیم اسلامی کا قیام

تحریکی کام کے لیے ڈاکٹر صاحبؒ نے ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی کا قیام تو عمل میں لائے لیکن ڈاکٹر صاحب نے جماعت کی امارت کی ذمہ داری قبول نہیں کی بلکہ کنوینر کے طور پر کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر صاحبؒ کی خواہش تھی کہ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے کوئی بزرگ اس جماعت کی امارت کا منصب سنبھالیں۔ ڈھائی سال کے انتظار کے باوجود کوئی بزرگ اس کے لئے تیار نہ ہوئے۔ بالآخر اگست ۱۹۷۷ء میں تنظیم اسلامی کے تیسرے سالانہ اجتماع کے موقع پر ڈاکٹر صاحبؒ نے تنظیم اسلامی کی امارت کی ذمہ داری قبول کی اور طے کیا کہ اس جماعت کی اساس قرآن وسنت اور سلف صالحین کے آثار سے ماخوذ بیعت سمع و طاعت کے اصول پر ہوگی۔

۱۹۷۷ء میں ڈاکٹر صاحب نے باغ جناح لاہور میں واقع مسجد دار السلام میں خطابِ جمعہ دینے کا آغاز کیا۔ اس سے قبل ڈاکٹر صاحب نے دس سال مسجد خضراء سمن آباد لاہور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں خطاب جمعہ دیتے رہے۔ مارچ ۱۹۷۷ء میں جب دینی و سیکولر جماعتوں کے اتحاد یعنی پاکستان قومی اتحاد نے انتخابات میں دھاندلی کے خلاف تحریک چلائی تو اُسے تحریک نظام مصطفی ﷺ کا نام دے دیا۔ مسجد خضراء کی انتظامیہ کی خواہش تھی کہ ڈاکٹر صاحب اس تحریک کی حمایت میں خطاب جمعہ کے ذریعے بیانات ارشاد فرمائیں۔ ڈاکٹر صاحبؒ کا موقف تھا کہ یہ تحریک 'نظام مصطفی' کے نفاذ کے لیے نہیں بلکہ صرف بھٹو حکومت گرانے کے لیے ہے۔ عوام کو سڑکوں پر لانے کے لیے نظام مصطفی کا نعرہ اختیار کیا گیا ہے۔ مسجد خضراء کی انتظامیہ نے ڈاکٹر صاحب کا موقف تسلیم نہیں کیا اور اُنہیں خطاب جمعہ کی ذمہ داری سے ہٹا دیا۔ بعد ازاں وقت نے ثابت کیا کہ ڈاکٹر صاحبؒ کا موقف کس قدر برحق تھا۔

۱۹۷۷ء میں جنرل ضیاء الحق نے ملک میں مارشل لاء لگایا اور اقتدار پر قبضہ کیا۔ انہوں نے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے اسلام کے نفاذ کو اپنی حکومت کا مقصد قرار دیا اور دینی و مذہبی رہنماؤں سے قریبی ربط وضبط رکھا۔ وہ ماضی میں ڈاکٹر صاحبؒ کے دروس قرآنی میں شریک ہوتے رہے تھے لہٰذا اُنہوں نے ڈاکٹر صاحبؒ کے لیے بھی پذیرائی کا خاص اہتمام کیا۔ کئی مقامات پر اعلیٰ فوجی افسران کے سامنے ڈاکٹر صاحبؒ کو سیرت کے موضوع پر خطاب کے مواقع فراہم کیے۔ پاکستان ٹیلی ویژن پر اپریل ۸۱ تا جون ۱۹۸۲ الہدیٰ پروگرام ہر ہفتہ باقاعدگی سے نشر ہوتا رہا جس کی وجہ سے ڈاکٹر صاحبؒ اور ان کی فکر قرآنی کا وسیع پیمانے پر تعارف ہوا۔ جون ۸۱ء میں شرعی پردہ کے حوالے سے ڈاکٹر صاحبؒ کے موقف پر خواتین کی طرف سے مظاہرے ہوئے اور الہدیٰ پروگرام بند کر دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے متبادل کے طور پر پاکستان کے کئی بڑے شہروں میں شام الہدیٰ کے عنوان سے دروس قرآن کا سلسلہ شروع کیا جن سے کثیر تعداد میں لوگوں نے استفادہ کیا۔

۱۹۸۱ء میں جنرل ضیاء الحق نے ڈاکٹر صاحبؒ کو شوریٰ میں شمولیت کی دعوت دی۔ ڈاکٹر صاحب نے انکار کیا تو اُنہوں نے کہا کہ آپ مجھے مسجد کے منبر پر بیٹھ کر کے مشورے دیتے رہتے ہیں۔ اب میں باقاعدہ اس کے لیے فورم بنا رہا ہوں تو آپ کیوں انکار کر رہے ہیں؟ ڈاکٹر صاحب نے ضیاء الحق کی دلیل کو تسلیم کرلیا اور شوریٰ میں شامل ہو گئے۔ ڈھائی ماہ

کے دوران ڈاکٹر صاحبؒ کو اندازہ ہو گیا کہ شوریٰ کا ادارہ صرف خانہ پوری کے لیے ہے تاکہ عالمی برادری کو تاثر دیا جائے کہ ضیاء الحق آمر کے طور پر نہیں بلکہ مشاورت سے حکومت کا نظام چلا رہا ہے۔ درحقیقت شوریٰ کا ادارہ صرف زبانی جمع خرچ کے لیے ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر صاحب نے ڈھائی ماہ بعد ہی شوریٰ سے استعفیٰ دے دیا۔

۱۹۸۴ء میں ڈاکٹر صاحبؒ نے رمضان المبارک کے دوران نماز تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمۂ قرآن کا آغاز کیا۔ مقصد یہ تھا کہ لوگ قرآن کی ہدایت سے آشنا ہوں۔ مزید یہ کہ رات کا طویل حصہ قرآن کے ساتھ بسر ہو تاکہ حسب ارشاد رسول ﷺ روز قیامت قرآن شرکاء کے حق میں یہ سفارش کر سکے کہ یہ لوگ میری وجہ سے جاگتے رہے۔ اس پروگرام کو اللہ نے خصوصی شرف قبولیت بخشا اور ہر سال اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ پروگرام کرنے کی سعادت لاہور کے علاوہ کراچی، ملتان، ابوظہبی اور امریکہ میں بھی حاصل کی۔ اب ڈاکٹر صاحبؒ کے ایک سو سے زائد شاگرد ہیں جو ہر سال خدمت قرآنی کی اس صورت کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

۱۹۸۴ء کے اواخر میں ڈاکٹر صاحب نے مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں "منہج انقلاب نبوی ﷺ" کے موضوع پر خطابات کا آغاز کیا۔ مجموعی طور پر ڈاکٹر صاحب نے اس موضوع پر گیارہ خطابات ارشاد فرمائے جنہیں بعد میں کتابی صورت میں مرتب کرلیا گیا۔ بلامبالغہ سیرت النبی ﷺ کے عملی وانقلابی پہلو کے اعتبار سے یہ خطابات کا ایک معرکۃ الآراء مجموعہ ہے۔ ۱۹۸۵ء میں ڈاکٹر صاحب نے اہل پاکستان کو خبردار کیا کہ اُنہیں آزادی حاصل کیے ہوئے ۳۸ برس مکمل ہو رہے ہیں۔ اگر اب بھی اسلام کی طرف پیش قدمی نہ کی تو عذاب الٰہی کے سامنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اس حوالے سے اُنہوں نے ایک کتاب "استحکام پاکستان" تحریر کی اور اس موضوع پر کئی شہروں میں خطابات دیے۔

۱۹۸۷ء میں سینیٹر مولانا سمیع الحق اور قاضی عبداللطیف نے ملک میں نفاذ شریعت کے لیے سینیٹ میں ایک شریعت بل پیش کیا۔ تمام دینی جماعتیں اس بل کی منظوری کے لیے "متحدہ شریعت محاذ" کے نام سے متحد ہو گئیں۔ حکومت کو دھمکی دی گئی کہ اگر ۲۷ رمضان المبارک تک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شریعت بل منظور نہ کیا گیا تو دینی جماعتوں کے اراکین اسمبلی و سینیٹ سے استعفیٰ دے دیں گے اور حکومت کے خلاف احتجاجی تحریک چلائیں گے ۔ ڈاکٹر صاحب اس محاذ کی سرگرمیوں میں انتہائی فعال طور پر سرگرم ہوئے ۔ کراچی کے ایک جلسہ میں کئی اکابر علماء کی موجودگی میں انہوں نے تجویز دی کہ ہمیں منظم احتجاج کے لیے ایک امیر کی قیادت پر متفق ہونا ہوگا اور اُس سے بیعت سمع و طاعت کرنی ہوگی ۔ انہوں نے امیر کے لیے مولانا سمیع الحق کے والد مولانا عبدالحق " کا نام پیش کیا ۔ افسوس کہ دیگر علماء نے شریعت کے نفاذ کی اہمیت پر تو خوب زور دیا لیکن عملی جدوجہد کے لیے ڈاکٹر صاحب کی تجویز کا ذکر تک نہیں کیا ۔ جب ۲۷ رمضان المبارک کی تاریخ آئی تو دینی جماعتوں کے اراکین نے اسمبلی اور سینیٹ سے استعفیٰ دینے سے انکار کر دیا ۔ ایک رکن اسمبلی نے کہا کہ ہم کیوں استعفیٰ دیں ۔ ہم دین کے دشمنوں کو ان اداروں سے نکال باہر کریں گے ۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ سوچ کس حد تک قابل عمل تھی؟ بہر حال دینی جماعتوں کے اس طرز عمل نے ڈاکٹر صاحب کو شدید مایوس کیا اور ڈاکٹر صاحب نے اس روش کو ایک بہت بڑا المیہ قرار دیا ۔

اس دوران ڈاکٹر صاحبؒ سالانہ بنیادوں پر محاضرات قرآنی کا انعقاد کرتے رہے ۔ یہ محاضرات اہم دینی موضوعات پر منعقد ہوئے جن میں مختلف مکاتبِ فکر کے جید علماء اور دانشوروں نے گراں قدر خطابات اور مقالے پیش کیے ۔ ان محاضرات کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ مختلف مکاتبِ فکر کے علماء ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے ایک دوسرے کے خیالات سے مستفید ہوئے اور باہم دوریوں میں کمی آئی ۔ ۱۹۹۱ء میں امریکہ نے عراق پر حملہ کیا تو ڈاکٹر صاحبؒ نے وطن عزیز کے طول و عرض میں امریکہ کے اصل عزائم یعنی عظیم تر اسرائیل (GREATER ISRAIEL) کے قیام کو بے نقاب کیا ۔ اسی سال ڈاکٹر صاحبؒ نے تحریک خلافت پاکستان کے قیام کا اعلان کیا ۔ خلافت کے حوالے سے تاریخی مقام خالق دینا ہال کراچی میں کیا ۔ آپ نے کئی شہروں میں نظام خلافت کیا کیوں اور کیسے؟ کے موضوع پر خطابات ارشاد فرمائے ۔

ستمبر ۱۹۹۶ء میں ڈاکٹر صاحبؒ نے رفقاءِ تنظیم اسلامی کو آگاہ کر دیا کہ وہ قمری اعتبار سے مسنون عمر یعنی ۶۳ برس کے ہو چکے ہیں لہٰذا اب دنیا سے رخصت ہونے کی تیاری شروع کر

رہے ہیں ۔ انہوں نے بعض املاک جو اُن کے ذاتی نام پر تھیں، اقامتِ دین اور دینی حق ٹرسٹ کے نام منتقل کر دیں تا کہ اُن کے بعد ان املاک پر اُن کا کوئی وارث ملکیت کا دعویٰ نہ کر سکے اور ان املاک کا استعمال دینی مقاصد کے لیے ہوتا رہے ۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے یہ واضح کرنے کے لیے کہ انہوں نے دین کی خدمت کو مالی منفعت کے حصول کا ذریعہ نہیں بنایا، ایک کتاب "حسابِ کم و بیش" کے نام سے تحریر کی ۔ اس کتاب میں انہوں نے زندگی بھر کی آمدنی اور اخراجات کا حساب پیش کر دیا ۔ اپنی خدماتِ قرآنی کا جائزہ پیش کرنے کے لیے ایک کتاب دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر تحریر کی ۔ تنظیم اسلامی میں اپنے جانشین کا فیصلہ کرنے کے حوالے سے وسیع تر مشاورت کا آغاز کیا ۔ مسلسل چھ برس کی مشاورت کے بعد فروری ۱۹۹۸ء میں محترم حافظ عاکف سعید صاحب کو اپنا جانشین مقرر کرنے کا اعلان کیا ۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے اگست ۱۹۹۴ء میں حزب التحریر کے تحت عالمی خلافت کانفرنس لندن میں "منہج انقلاب نبوی ﷺ" کے موضوع پر انگریزی میں خطاب کیا ۔ پھر ۱۹۹۵ء اور ۱۹۹۶ء میں امریکہ جا کر انگریزی میں دورۂ ترجمۂ قرآن ریکارڈ کرایا ۔

۱۹۹۷ء میں مسلم لیگ کو عام انتخابات میں شاندار کامیابی حاصل ہوئی اور اُسے قومی اسمبلی میں دو تہائی اکثریت حاصل ہوگئی ۔ اب ڈاکٹر صاحب نے نواز شریف سے کئی ملاقاتیں کیں اور انہیں دستور پاکستان میں شامل کرنے کے لیے ایسی ترامیم مرتب کر کے دیں جس سے وطن عزیز میں اسلامی قوانین کا نفاذ ممکن ہو سکے ۔ رفقاءِ تنظیم اسلامی نے بھی اس حوالے سے بھرپور مہم چلائی اور لاکھوں کی تعداد میں مجوزہ ترامیم کا خاکہ حکومت کو بذریعہ ڈاک بھیجا ۔ بدقسمتی سے مسلم لیگ کی حکومت نے دستور پاکستان کو اسلامی بنانے اور اُس میں سے منافقانہ شقیں خارج کرنے کا بہترین موقع گنوا دیا ۔

۱۹۹۸ء میں ڈاکٹر صاحبؒ نے کراچی میں دورۂ ترجمۂ قرآن کیا جس کی ویڈیو ریکارڈنگ جدید Digital کیمروں کے ذریعہ کی گئی ۔ مختلف ملکی اور بیرون ممالک کے ٹی چینل ڈاکٹر صاحب کے دروس اور لیکچرز کو نشر کر رہے ہیں ۔ اور پیغام قرآنی سو سے زائد مسلم و غیر مسلم ممالک تک پہنچ رہا ہے ۔ ۱۹۹۸ء میں ڈاکٹر صاحبؒ کے دونوں گھٹنوں کا آپریشن ہوا ۔ اسی سال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آپ نے دینی جماعتوں کو متحد کرنے کی ایک اور کوشش کی اور متحدہ اسلامی انقلابی محاذ قائم کیا جس کا مطالبہ یہ تھا کہ دستور پاکستان میں شریعت کی بالادستی کو تسلیم کیا جائے۔ کسی بڑی جماعت نے اس محاذ میں شمولیت اختیار نہیں کی اور یہ کوشش بھی کامیابی سے ہمکنار نہ ہوئی۔ اس محاذ کے تحت ڈاکٹر صاحبؒ نے کئی بڑے شہروں میں منہج انقلاب نبوی ﷺ کے عنوان سے پروگرام کیے اور جید علما کو اس موضوع پر اظہار خیال کے لیے جمع کیا۔

۲۰۰۲ء میں ڈاکٹر صاحبؒ نے کئی عوارض اور بیماریوں کی وجہ سے تنظیم کی امارت سے معذرت کی اور امارت کی ذمہ داری محترم حافظ عاکف سعید صاحب کو منتقل کر دی۔ سب سے پہلے ڈاکٹر صاحبؒ نے خود حافظ عاکف سعید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی۔ تنظیم اسلامی کی امارت سے سبکدوش ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنی ساری توجہ علمی، فکری اور تبلیغی امور کی طرف مرکوز کر دی۔ روزنامہ نوائے وقت اور جنگ میں کالم تحریر کرتے رہے، اہم ملکی اداروں میں لیکچرز دیتے رہے اور ملک کے طول و عرض میں دروس قرآن اور مختلف موضوعات پر خطابات ارشاد فرماتے رہے۔ جب بھی کہیں سے بیان کی دعوت آئی ڈاکٹر صاحبؒ نے نہ فاصلوں کی صعوبتوں کو دیکھا، نہ راستوں کی دشوارگزاری کو رکاوٹ سمجھا، نہ اپنی بیماری اور معذوری کی پروا کی اور نہ ہی اپنی پیرانہ سالی کی کمزوریوں کو عذر بنایا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہر ایسی دعوت پر لبیک کہا اور جا کر اللہ کا پیغام پورے جذبے کے ساتھ پہنچانے کی بھرپور کوشش کی۔

۲۰۰۴ء میں ڈاکٹر صاحبؒ نے ڈاکٹر ذاکر نائیک کی دعوت پر بھارت کا دورہ کیا۔ وہاں بڑے بڑے عوامی اجتماعات سے کئی کئی گھنٹے خطاب کیا اور اسٹوڈیو میں کئی لیکچرز ریکارڈ کرائے۔ Peace ٹی وی چینل پر یہ خطابات اور لیکچرز نشر ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بھارت کے کئی شہروں میں خطابات و دروس دیے۔

آخری لمحات

مورخہ ۴ تا ۹ اپریل ۲۰۱۰ء کو قرآن اکیڈمی فیصل آباد میں تنظیم اسلامی کے ذمہ داران کے لیے ایک تربیتی کورس کا انعقاد کیا گیا۔ اس کورس کے لیے تجویز کردہ نصاب کو ڈاکٹر صاحب نے بہت پسند فرمایا اور اس اجتماع میں کل وقتی شرکت کا فیصلہ کیا۔ اس دوران انہوں نے ۴

اور ۵ اپریل کو ملک بھر سے جمع ہونے والے تنظیم اسلامی کے ذمہ داران کو دو دو گھنٹے کے دورانیے پر مشتمل لیکچرز دیے۔ یہ خطاب ڈاکٹر صاحبؒ کا اپنے شاگردوں سے آخری خطاب ثابت ہوا۔ ۵ اپریل کی شام کو ایک پروگرام کے لیے تشریف لائے، لیکن بجلی کے نظام کی خرابی کی وجہ سے یہ پروگرام نہ ہو سکا۔ البتہ ڈاکٹر صاحبؒ اس انتظار میں کہ شاید بجلی بحال ہو جائے تشریف فرما رہے۔ لیکن زیادہ بیٹھنے کی وجہ سے رات سوتے وقت کمر کے درد میں شدت پیدا ہوئی جس کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب تڑپ اُٹھے۔ پھر ڈاکٹر صاحب ۶ اپریل کو دن ۱۱ بجے تشریف لائے اور اعلان کیا کہ اب میرے لیے مزید اس کورس میں پڑھانا ممکن نہیں رہا۔ اور فرمایا کہ شاید میری یہ آپ سے آخری ملاقات ہے۔ اس دوران ڈاکٹر صاحبؒ نے شرکاء کے چند سوالات کے جوابات دیے اور اس دوران بھی بار بار اُن پر رقت طاری ہوتی رہی۔ ۹ اپریل کو فیصل آباد ہی میں تنظیم کی مرکزی شوریٰ کا اجلاس تھا۔ ڈاکٹر صاحب باوجود بیماری کے اس اجلاس میں شرکت کے لیے لاہور سے تشریف لائے۔ فرمایا کہ شاید آخری بار آپ سے ملاقات کے لیے آیا ہوں۔ اور فکر انگیز گفتگو میں رفقائے تنظیم سے فرمایا آج میں یہ پیغام دینے کے لیے آیا ہوں کہ اس ظالمانہ نظام کے خلاف اپنے جذبات کو سرد نہ ہونے دینا اور دین حق کی سربلندی کے لیے اپنی جدوجہد کو تیز سے تیز تر کرنا یعنی ساتھیو! مشعلوں کو تیز کرو۔ حالات بڑی تیزی سے تباہی کی طرف جا رہے ہیں۔ دین، ملت اور ملک کے خیر خواہوں کو چاہیے کہ اپنے زیادہ وسائل، اوقات اور توانائیاں حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے وقف کر دیں۔ مورخہ ۱۳ اپریل کو رات ساڑھے گیارہ بجے ڈاکٹر صاحب کے فرزند ڈاکٹر عارف رشید صاحب نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحبؒ کو بخار ہے۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ کیا کسی معالج کو دکھا دیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے منع فرمایا اور چند ادویات لے کر سو گئے۔ رات ڈھائی بجے ڈاکٹر صاحبؒ کے خادم نے محسوس کیا کہ آپ کے سانس لینے کی آواز نہیں آ رہی۔ قریب جا کر دیکھا تو آپ ساکت لیٹے ہوئے تھے۔ خادم نے ڈاکٹر عارف رشید صاحب کو فون کر کے بلایا۔ انہوں نے آ کر ڈاکٹر صاحبؒ کا معائنہ کیا اور بتایا کہ اللہ کے دین کا خادم اللہ کے پاس پہنچ گیا ہے۔ ۱۳ اور ۱۴ اپریل ۲۰۱۰ء کی درمیانی شب ڈاکٹر صاحب اس دار فانی سے دار البقاء کی طرف کوچ کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

راجعون۔ڈاکٹر صاحب اپنی آخری عمر میں کبھی وجد کے عالم میں حافظ شیرازی کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

حاصل عمر نثار رہ یارے کردم!!
شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

"میں نے اپنی زندگی کا کل سرمایہ محبوب کی راہ میں نچھاور کردیا۔ میں خوش ہوں اپنی بچی ہوئی زندگی سے کہ میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا"۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا مسلک

ڈاکٹر صاحب اپنے آپ کو زور دے کر سنی مسلمان کہتے تھے۔ لیکن اہل سنت کی ذیلی تقسیمات میں سے کسی خاص تقسیم کی طرف منسوب کرنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ جیسے دیوبندی بریلوی اور اہل حدیث وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی قائم کردہ جماعت 'تنظیم اسلامی' کسی خاص مسلک کی نمائندہ نہیں۔ بلکہ مسلکی اختلافات سے بالاتر ہوکر نظام خلافت کے لیے کوشاں ہے۔ فقہی معاملات کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

"فقہی معاملات میں اکثر وبیشتر میرا طرز عمل وہی ہے جو میرے والدین کا تھا۔وہ حنفی المسلک تھے (غفر اللہ لھم)میں بھی اکثر و بیشتر احناف کی پیروی کرتا ہوں ۔لیکن جن معاملات میں کسی وجہ سے تحقیق و تفتیش کی ضرورت پیش آجائے تو میں نے ان کے ضمن میں اپنے لیے دو باتیں طے کی ہیں۔اولاً:یہ کہ اگر کوئی مسئلہ جس پر اہلسنت کے چاروں مکاتب فکر حنفی ،مالکی ،شافعی اور حنبلی متفق ہوں تو وہ معاملہ اگر چہ عقلاً میری ذاتی رائے میں نہ آئے تب بھی اس میں تقلید کا پابند ہوں اور ان مسالک سے باہر نکلنے کو جائز نہیں سمجھتا ،کیوں کہ ایسا تو صرف مجتہد مطلق ہی کرسکتا ہے جب کہ میں تو محض "مجتہد" ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کرتا۔ ثانیاً:اگر کوئی ایسا معاملہ ہو جس کے متعلق ہمارے مکاتب فکر کے درمیان اختلاف رائے پایا جائے تو اس میں ترجیح کا معاملہ کر لیتا

ہوں ۔جدید فقہی اصطلاح میں اسے "تلفیق بین المذاہب" کہا جاتا ہے ۔اسے اگر چہ بعض لوگ جرم سمجھتے ہیں،لیکن حقیقت یہ ہے کہ عہدحاضر میں اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ۔"(۱۴)

ڈاکٹر اسرار احمدؒ اور استحکام پاکستان

ڈاکٹر اسرار احمدؒ ملکی اور قومی معاملات پر گہری نظر رکھتے تھے جس کا اندازہ ان کی مختلف تحریروں اور خطابات سے ہوتا ہے۔وہ استحکام پاکستان کو نفاذ اسلام کے ساتھ جوڑتے تھے۔ڈاکٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"الغرض پاکستان کے بقاء ودوام اور اس کی ترقی و استحکام کی واحد ممکنہ اساس وہ مذہبی جذبہ بن سکتا ہے جو قومی و نسلی نہیں بلکہ حقیقی اور عملی اسلام اور اس کی بھی 'متجددانہ' اور 'دانشورانہ' تعبیر نہیں بلکہ علمائے کرام کے مصدقہ تصورات پر مبنی ہو اور نری جامد مذہبیت نہیں بلکہ ایک متحرک انقلابیت کی صورت اختیار کرے اور یہ چیز خود اسلام کے اعتبار سے بھی تجدد نہیں بلکہ صرف تجدید کا مظہر ہوگی اور پاکستان کے نقطہ نگاہ سے بھی کسی نئی منزل کی جانب رُخ موڑنے کی نہیں بلکہ" کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو" کے مصداق اپنے تاسیسی نظریہ و مقصد کی جانب رجوع کے مترادف ہوگی"۔(۱۵)

مذہبی جماعتوں کے اتحاد کے لیے مساعی

ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ نے مختلف مواقع پر مذہبی جماعتوں کے اتحاد پر زور دیا۔اور مذہبی جماعتوں کے قائدین کے ساتھ اس سلسلے میں خاص مشاورتیں بھی کیں۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے تمام مذہبی جماعتوں کو تجویز دی کہ اولاً ، وہ آپس میں محاذ آرائی ترک کردیں ۔ثانیاً،ہم خیال اور نظریاتی جماعتیں آپس میں ایک دوسرے سے تعاون کریں ۔ثالثاً،سب کا اتحاد نہ بھی ہوتب بھی آپس میں ایک وفاق کی شکل بنالیں ۔اس سلسلے میں خاص طور پر جماعت اسلامی تحریک اسلامی اور تنظیم اسلامی کو ایک وفاق کی شکل بنانے کے لیے مساعی کی لیکن وہ اس میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کامیاب نہ ہو سکے۔

Prof John Esposito and Prof Ibrahim Kalin آراء اپنی کتاب the500 most influential muslims میں لکھتے ہیں:

"Ahmed is the founder of Tanzeem-e-Islami. He is a well-respected figure among the Muslim populations of Pakistan, the Middle East, and North America—known specifically for his efforts to bring educated Muslims towards the teachings of the Qur'an. He believes in a 'dynamic' conception of Islam with the ultimate objective of establishing a 'true' Islamic state. Ahmad has a daily show on satellite channel Peace TV, has written over 60 books, and has been lauded by the State of Pakistan for his work" (16)

حوالہ جات

۱۔مرکز تعلیم و تحقیق قرآن اکیڈمی یاسین آباد، ڈاکٹر اسرار احمد اور تنظیم اسلامی۔ایک تعارف، انجمن خدام القرآن سندھ، کراچی، جون ۲۰۱۱ء، صفحہ ۱۲۷، ۱۲۸

۲۔ڈاکٹر اسرار احمد، عزم تنظیم، مکتبہ انجمن خدام القرآن لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۱۳،۱۴

۳۔ایضاً، ص۔۱۸

۴۔ ڈاکٹر اسرار احمد، جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی، مکتبہ انجمن خدام القرآن لاہور، جولائی ۱۹۹۳ء، ص۔۳۲۵

۵۔محولہ بالا عزم تنظیم، ص۔۳۲

۶۔ڈاکٹر اسرار احمد، تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ، مکتبہ تنظیم اسلامی (لاہور)، جنوری ۱۹۸۶ء، ص۔۱۱۵

۷۔محولہ بالا عزم تنظیم، ص۔۳۶

۸۔محولہ بالا عزم تنظیم، ص۔۳۹

۹۔محولہ بالا عزم تنظیم، ص۔۳۳

۱۰۔ڈاکٹر اسرار احمد، اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام، مکتبہ انجمن خدام القرآن لاہور، ۱۹۸۲ء، ص۔۴

۱۱۔ایضاً، ص۔۲

۱۲۔ڈاکٹر اسرار احمد، مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق، مکتبہ انجمن خدام القرآن لاہور، ۲۰۰۲ء، ص۔۵۰

۱۳۔محولہ بالا عزم تنظیم، ص۔۴۹

۱۴۔ڈاکٹر اسرار احمد، شیعہ سنی مفاہمت کی ضرورت اور اہمیت، مکتبہ انجمن خدام القرآن لاہور، اگست ۲۰۰۶ء، ص۔۷۰،۷۱

۱۵۔ڈاکٹر اسرار احمد، استحکام پاکستان، مکتبہ انجمن خدام القرآن لاہور، ۱۹۸۶ء، ص۔۹۷

16.Prof John Esposito and Prof Ibrahim Kalin,the500 most influential muslims,the royal islamic strategic studies centre, 2009.p.97

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

التفسیر، مجلس تفسیر، کراچی جلد ۲، شمارہ ۱۸/۱۹، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ء

پروفیسر علی محسن صدیقی

ہائے کیا لوگ تھے جو دامِ اجل میں آئے

ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر

Ali Mohsin Siddique (1929-2012) was a renowned scholar and historian of Pakistan. Beside three books and more than fifty research articles, he has translated seven books from Arabic/Persian/English into Urdu. These books are mainly on aqaid i.e. dogmatic theology and its historical development. In this paper I am trying to evaluate Ali Mohsin Siddique as a historian, with special reference of his translation work.

اسلامی تاریخ کا مضمون جتنا وسیع، عمیق اور اہم ہے، پاکستان میں اس کے ماہرین کی تعداد اتنی ہی کم ہے۔ تخصص کے اس دور میں اسلامی تاریخ کی متعدد شاخیں کی جا سکتی ہیں مثلاً مسلمانوں کی سیاسی تاریخ، علمی تاریخ، ادبی و فنی تاریخ، سماجی و ثقافتی تاریخ، عقائد اور فرقوں کی تاریخ، عسکری تاریخ، انتظامی تاریخ وغیرہ وغیرہ۔ اسلامی تاریخ کے ۱۴۰۰ سالوں کا احاطہ سیاسی خانوادوں کے حوالے سے بھی کیا جاتا ہے مثلاً اموی دور کی تاریخ، خلفاء بنوعباس کا دور، فاطمی دور خلافت اور عثمانی ترکوں کا دور وغیرہ۔ قرون کے حوالے سے بھی اسلامی تاریخ کی درجہ بندی کی گئی ہے مثلاً قرن اولیٰ (صدر اسلام) کی تاریخ، قرن وسطیٰ کی تاریخ یا عہد جدید کی تاریخ وعلیٰ ھذا القیاس۔ اس بحر ناپیدا کنار کے ماہرین خال خال ہیں اور یہ مضمون کم سے کم پاکستان کی حد تک قحط الرجال کا شکار رہا ہے۔ اس کم مائیگی کا احساس اس وقت اور بڑھ گیا جب ۱۴ر جنوری ۲۰۱۲ء کو علی محسن صدیقی صاحب بھی ۸۳ برس کی عمر میں چل بسے۔

میری خواہش پر ایک بار علی محسن صدیقی صاحب نے اپنی زندگی کے بارے میں ایک شذرہ "سن کر ....." لکھا تھا یہ قلمی شذرہ جس پر ۱۳ر اکتوبر ۲۰۰۹ء کی تاریخ پڑی ہے، میرے پاس محفوظ ہے، اس کے مطابق علی محسن صدیقی اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

> "میں ۱۹۲۹ء میں یوپی (ہندوستان) کے شہر غازی پور میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد مشرقی یوپی کی مشہور درس گاہ چشمۂ رحمت اورینٹل کالج میں داخل ہوا۔ اس کالج میں عربی، فارسی اور اسلامی علوم کی تعلیمات کے علاوہ جدید علوم اور انگریزی زبان کی تعلیم دی جاتی تھی۔ میں اس ادارہ میں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۶ء تک زیر تعلیم رہا اور عربی و فارسی درسیات کی تکمیل کی اور درس نظامی کے فاضل کی سند حاصل کی۔ صوبۂ یوپی کے عربی و فارسی امتحانات یعنی کامل ادب فارسی، عالم، فاضل ادب عربی اور فاضل دینیات کی اسناد حکومت یوپی سے حاصل کیں اور تمام امتحانات میں اعلیٰ نمبروں سے کامیاب ہوا۔ بعدازاں ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات فرسٹ ڈویژن میں پاس کئے۔ ۱۹۴۶ء میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مشرق پاکستان کے دارالحکومت ڈھاکہ کی جانب ہجرت کی اور ڈھاکہ یونیورسٹی سے بی اے آنرز کا امتحان امتیازی نمبر سے پاس کیا۔ ۱۹۵۳ء میں ڈھاکہ سے کراچی ہجرت ثانیہ کی۔ یہاں ریڈیو پاکستان اور حکومت پاکستان کے بعض دفاتر میں ملازمت کی اور اس کے دوران میں نے کراچی یونیورسٹی سے اردو، عربی اور اسلامی تاریخ میں ایم اے کی اسناد حاصل کیں۔ آخر الذکر دو مضامین میں اول درجہ اول رہا۔ اس کے بعد اردو کالج میں اسلامی تاریخ کا لیکچرار مقرر ہوا اور کئی سال تک یہاں خدمت انجام دینے کے بعد کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اسلامی تاریخ میں لیکچرار ہوا۔ کراچی یونیورسٹی میں لیکچرار، اسسٹنٹ پروفیسر، ایسوسی ایٹ پروفیسر اور پروفیسر رہا اور ۱۹۹۱ء میں پروفیسر کی حیثیت سے یونیورسٹی سے ریٹائر ہوا۔

یادش بخیر ۱ جنوری ۱۹۷۵ء میں جب میں نے شعبہ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی میں بی اے آنرز سال اول میں داخلہ کے لئے درخواست دی اس وقت صدیقی صاحب صدر شعبہ تھے۔ داخلہ فہرست میں، جو اس زمانے میں شعبہ کے نوٹس بورڈ پر آویزاں کی جاتی تھی، اس میں میرا نام نہیں تھا، یہ میرے لئے سخت تعجب کی بات تھی کیونکہ ایف ایس سی میں میری فرسٹ ڈویژن تھی، کراچی یونیورسٹی میں دو شعبوں میں داخلے کے لئے فارم بھرا تھا، ایک بایوکیمسٹری اور دوسرے تاریخ اسلام۔ بایوکیمسٹری کی داخلہ لسٹ میں میرا نام موجود تھا لیکن اسلامی تاریخ میں میرا داخلہ نہیں ہوا تھا۔ میں اپنے معاملے کی تحقیق کے لئے صدر شعبہ سے ملنے گئی، یہ علی محسن صدیقی سے میری پہلی ملاقات تھی۔

''جی آپ کا کیا مسئلہ ہے؟''

''سر میرا نام داخلہ فہرست میں نہیں ہے''

''تو کیا تھرڈ ڈویژن آئی تھی؟''

''جی نہیں۔۔۔ ڈویژن تو فرسٹ ہے''

''تو پھر داخلہ کیوں نہیں ہوا؟'' یہ کہتے ہوئے انھوں نے داخلہ فارم کا پلندہ اٹھایا، میرا نام پوچھا، میرا فارم تلاش کر کے اسے بغور دیکھتے رہے اور پھر کہا، ''بی بی آپ نے فارم پر اپنے دستخط نہیں کئے ہیں''۔

یہ وہ حماقت تھی جس کی مجھ سے بجا طور پر توقع کی جاسکتی تھی۔

''سر اگر اب کر دوں۔۔۔؟''

''آپ نے کہیں اور بھی اپلائی کیا ہے؟''

''جی سر بایوکیمسٹری میں''

''تو کیا رہا؟''

''وہاں ایڈمشن ہوگیا ہے''

''تو پھر تو ظاہر ہے کہ تم وہیں جاؤ گی۔۔۔ تم نے ایف ایس سی کیا ہے تم پری میڈیکل کی طالبہ ہو''

''جی نہیں سر میں اسلامک ہسٹری پڑھنا چاہتی ہوں''

انھوں نے پہلی بار سر اٹھا کر مجھے غور سے دیکھا پھر فارم میرے سامنے رکھ دیا، میں نے فارم پر دستخط کر دیئے اور شعبہ اسلامی تاریخ میں میرا داخلہ ہوگیا۔

شعبہ میں علی محسن صدیقی صاحب کی بڑی دھاک تھی، طلبہ و طالبات ان کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔ آنرز کے ابتدائی دو سال تو ہم ان کی تدریس سے محروم رہے۔ جب میں آنرز تھرڈ ایئر میں آئی تو صدیقی صاحب ہمیں ''بنوعباس'' کا مضمون پڑھاتے تھے۔ ان کے علاوہ ہمارے کئی اساتذہ اور بھی تھے لیکن صدیقی صاحب ایک دریا ساگر تھے، شعبے کے یہ واحد استاد تھے جو کلاس میں کسی نوٹس وغیرہ کے بغیر آتے تھے، لیکچر دینے کا انداز انتہائی سنجیدہ، باوقار اور علمی تھا۔ کلاس میں کسی قسم کی بدتمیزی اور گڑبڑ برداشت نہیں کرتے تھے۔ نالائق طالب علموں کے لئے بہت سخت تھے لیکن اچھے طالب علموں کے لئے پدر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مہربان سے کم نہیں تھے۔ ایم اے فائنل میں وہ ہمیں "جدید دنیائے اسلام" کا مضمون پڑھاتے تھے۔

ستمبر ۱۹۸۷ء میں میں بحیثیت کوآپریٹیو ٹیچر کے شعبہ اسلامی تاریخ سے وابستہ ہوئی تو چند ماہ بعد ہی علی محسن صدیقی صاحب شعبہ معارف اسلامیہ میں پروفیسر مقرر ہوکر چلے گئے، تاہم ہمارے شعبہ میں ان کا آنا جانا رہتا تھا۔ دوران طالب علمی میں بھی وہ مجھ سے چھوٹے موٹے علمی کام لیتے رہتے تھے، ان سے علمی رابطہ برابر قائم رہا، وہ مجھ سے کچھ نہ کچھ لکھواتے رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے ایک بار انھوں نے مجھے امام اوزاعی پر لکھنے کو کہا، میں نے ۱۷ فروری ۱۹۸۷ء کو یہ مضمون انھیں لکھ کے دیا، انھوں نے پسند کیا لیکن ساتھ ہی نصیحت کی کہ عربی کی استعداد بڑھانی ہوگی تاکہ اس سے بہتر مضمون لکھا جاسکے۔

وہ برابر مجھ سے علمی رابطہ رکھتے تھے، بعض اوقات استاد ہونے کا فائدہ بھی اٹھاتے تھے مثلاً یہ واقعہ میرے ذہن میں ہے، فروری ۱۹۸۷ء کی بات ہے، وہ بریگیڈیر گلزار احمد کی کتاب "حدیث دفاع" کی تلاش میں تھے، میں نے انھیں بتایا کہ یہ میرے ابو (ڈاکٹر افتخار احمد۔ م ۳۰/جون ۲۰۰۹ء) کے کتب خانے میں ہے، حکم ہوا فوراً کتاب حاضر کی جائے، میں نے اگلے ہی دن کتاب سر کی خدمت میں پیش کردی، انھوں نے کتاب کی فوٹو کاپی کرائی، جلد بندی کرواکے مجھے بھجوادی اور اصل نسخہ اپنے پاس رکھ لیا۔

تیرے عہد میں دل زار کے سبھی اختیار چلے گئے

شعبہ میں میری تقرری سے بہت خوش تھے، مجھے ان کا وہ خیر مقدمی جملہ اب تک یاد ہے جو انھوں نے ڈاکٹر محمد صابر (اس وقت کے صدر شعبہ) کے کمرے میں کہا تھا "میں نگار اور شکیل کے شعبہ میں تقرری سے بہت خوش ہوں اور اب مجھے شعبہ کے مستقبل کے بارے میں کوئی پریشانی نہیں ہے"۔ ایک ایسے استاد کے منہ سے جو کم ہی کسی کی تعریف کرتا ہو یہ جملے کسی اعزاز سے کم نہیں تھے۔ انھوں نے اسی طرح کی بات اپنی تالیف الصدیق کے مقدمے میں بھی لکھی ہے۔ ؎

اسلامی تاریخ کے مورخ کے لئے ضروری ہے کہ وہ عربی اور فارسی زبان سے نہ صرف واقف ہو بلکہ اس پر عبور بھی رکھتا ہو۔ صدیقی صاحب کو عربی اور فارسی دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا، انہوں نے فارسی کی انتہائی مشکل کتاب تاریخ جہاں کشائی کا اردو ترجمہ کرکے اپنی فارسی دانی کا سکہ بٹھا دیا تھا، انہوں نے عقائد کی چند اہم ترین کتابوں مثلاً الفرق بین الفرق، الملل و النحل اور عقائد مسلمین و مشرکین کو سبقاً سبقاً پڑھا تھا، اسی طرح کتب حدیث خصوصاً صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد اور کتاب الموطاء کو بھی سبقاً سبقاً پڑھا تھا جس نے ان کے علمی کینوس کو وسیع کیا اور واقعات کے تجزیات میں انہوں نے اپنے علم سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس تبحر علمی نے ان میں وہ اعتماد اور خیالات میں وہ وسعت پیدا کی جس نے واقعتاً صاحب نظر بنادیا۔

مجھے یاد ہے جامعہ کراچی میں اپنے شعبہ کے اساتذہ سے صدیقی صاحب مختلف موضوعات پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ اپنی گفتگو میں عموماً بڑے سنجیدہ اور باوقار تھے، مزاح کے موڈ میں بھی رکھ رکھاؤ کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے ان کے مزاح میں بھی ایک تمکنت ہوتی تھی۔ اگر کسی کے بارے میں یہ تذکرہ سامنے آئے کہ فلاں بہت بڑا عالم ہے تو محسن صاحب فوراً سوال کرتے تھے وہ کتنی زبانیں جانتا ہے؟ وہ کسی کی علمیت کا فیصلہ زبان دانی کے حوالے سے کرتے تھے، وہ محمد حمید اللہ کو اسی بنیاد پر بہت بڑا عالم سمجھتے تھے کہ وہ تقریباً سات زبانیں جانتے تھے۔ صدیقی صاحب تاریخی شعور پر بہت زور دیتے تھے وہ عموماً اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ اگر آپ نے ماضی کو حال کی عینک سے دیکھنے کی کوشش کی تو درست نتائج تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ مجھ سے کئی بار انہوں نے کہا کہ تاریخ کا معروضی مطالعہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب آپ میں تاریخی شعور ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

> "ہر دور، ہر معاشرہ اور ہر قوم کا ایک مزاج ہوتا ہے تاریخ کا طالب علم جب کسی عہد کے واقعات و حوادث کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے اس عہد کے احوال وظروف، اس قوم کے عوائد رسمیہ اور اس سوسائٹی کی اساس و روح سے واقف ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جس عہد کا وہ مطالعہ کرتا ہے،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کی عقلیت، اس کے اخلاق اور اس کے رسوم کو مدنظر رکھنا اور انہی معیاروں پر اشخاص و حوادث کو پرکھنا پڑتا ہے۔ ماضی کے افراد و حوادث کو حال کے معیار سے جانچنا۔۔۔ اور اس پر احوال ماضیہ کو مبنی برحق یا بر باطل قرار دینا تاریخ کے ساتھ ناانصافی ہے"

وہ مستشرقین کی تاریخ نگاری کو "تنقیص" اور مشرقی فضلاء کی تاریخ نویسی کو "تقریظ" سمجھتے ہیں اور دونوں کو رد کرتے ہیں

صدیقی صاحب کی تاریخ نگاری اصولوں پر مبنی تھی، اسلامی تاریخ نویسی کے جن اصولوں کی پیروی کی اس کا تذکرہ انہوں نے اپنی کتاب الصدیق کے مقدمہ میں کیا ہے۔ مآخذ کے ضمن میں صدیقی صاحب اسلامی تاریخ کا سب سے اول، اور مستند مآخذ قرآن کو مانتے ہیں۔ قرآن تاریخ کی کتاب نہیں ہے مگر عہد نبوی میں جو واقعات رونما ہوئے ان کا متعدد مقامات پر قرآن مجید میں ذکر موجود ہے۔ اسی طرح قرآن میں اقوام گزشتہ، انبیاء کرام اور اساطیر الاولین کے قصے، موعظت و عبرت پذیری کی غرض سے بار بار بیان ہوئے ہیں اور ضمناً بہت سے تاریخی واقعات بیان ہوگئے ہیں جسے علی محسن اہل اسلام کی تاریخ کے ہر دور کے لئے مستند ترین، موثق ترین اور معتبر ترین مآخذ قرار دیتے ہیں

ان کے نزدیک اسلامی تاریخ کا دوسرا اہم ماخذ کتب احادیث نبویہ ہیں۔ اس حوالے سے وہ تاریخ نویسی کا یہ اصول بتاتے ہیں کہ کسی ایک واقعہ سے متعلق اگر مجموعہ ہائے حدیث میں روایت، تاریخ کی کتاب کے خلاف ہے تو احادیث کی روایت کو بالعموم ترجیح ہوگی۔ وہ احادیث کو روایت تاریخیہ پر ترجیح دیتے ہیں اور ان سے تاریخی واقعات کی توثیق کا کام لیتے ہیں۔ یہ اس حوالے سے ان کی تالیف الصدیق میں واقعہ قرطاس کا جہاں بیان ہے وہاں روایات کی درایت کرتے ہیں اور اس درایت کے نتیجے میں صحیحین کی روایت کو بھی درایت کی کڑی کسوٹی پر پرکھتے ہیں

وہ ایک محتاط مورخ تھے، روایات کو انہوں نے قبول ضرور کیا لیکن ان کی جرح و تعدیل اور تاریخی حقائق کی روشنی میں ان کی توثیق یا تضعیف سے وہ کبھی غافل نہیں رہے۔ کسی روایت کی محض اس بناء پر توثیق نہیں کی گئی ہے کہ اس کے رواۃ ثقہ ہیں، بلکہ اسے اس عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے درایت کے کسوٹی پر پرکھا بھی گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"روایات کی اساس پر کارناموں کی عمارت تعمیر نہیں کی گئی ہے بلکہ واقعات تاریخیہ سے کارنامہ ہائے خلافت کو موثق، معتبر اور مستند قرار دیا گیا ہے۔ خصوصاً فضائل شخصی پر مبنی روایات کو بڑی احتیاط سے قبول کیا گیا اور اشخاص کی توصیف کے لئے اس عہد کے عوامل و ظروف کو پیش نظر رکھا گیا ہے، اس ضمن میں مجددانہ بحث کے بجائے مورخانہ تنقید اور تعقیب کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے اور تاریخ کو جو شعور وقت سے عبارت ہے، اس کے اسی درجہ میں رکھا گیا ہے"

بعض مقامات پر خصوصاً الصدیق کی تالیف کے دوران، انہوں نے اہل تشیع کی نہایت مستند کتاب "الکافی" سے بھی استفادہ کیا ہے۔ یہ کتاب ابوجعفر محمد بن یعقوب الرازی الکلینی (م ۳۲۸ھ) کی تالیف و تدوین ہے اور اسے فقہ جعفریہ میں وہی درجۂ ثقاہت حاصل ہے جو فقہ اہل سنت میں امام محمد بن اسماعیل بخاری (م ۲۵۶ھ) کی "الجامع الصحیح" کو حاصل ہے۔

قرآن و حدیث کے بعد اسلامی تاریخ کا تیسرا اہم مآخذ کتب سیرت و مغازی اور کتب طبقات ہیں اور پھر متقدمین مورخین کی کتب تاریخ ہیں۔ اسلامی تاریخ میں متعلقہ دور کی کتب ادب کو ایک مستند اور مفید مآخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ صدیقی صاحب کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں بالعموم تاریخ نویسی کے دوران عربی ادب کی کتابوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے حالانکہ ان کتابوں میں اشخاص و مجتمع کے متعلق معلومات موجود ہیں۔ آخری مآخذ کے طور پر صدیقی صاحب جدید مورخین کی کتب کو اہم گردانتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ مستشرقین کو مسترد کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے "..... مستشرقین نے ایک خاص نقطۂ نظر سے یہ کتابیں لکھی ہیں اور غیر جانب داری کے پردے میں انہوں نے حد درجہ تعصب سے کام لیا ہے مؤلف نے فرانسیسی، جرمن اور اطالوی زبانوں میں لکھی جانے والی کتب، ان کے انگریزی یا عربی تراجم کی مدد سے مطالعہ کی ہیں اور برموقع ان کی دسیسہ کاریوں سے قاری کو آگاہ بھی کیا ہے۔ ان کتابوں سے کسی طرح کا استفادہ کرنا بے سود ہے کہ یہ مستند وموثق ہیں ہی نہیں۔۱۰

محسن صاحب مستشرقین کو کبھی تو درخور اعتناء ہی نہیں سمجھتے اور اگر کبھی ان سے اخذ و اکتساب کرتے بھی ہیں تو محض ضمنی معاملات میں۔ مستشرقین کے بارے میں ان کی سخت رائے یہ ہے:

> مغربی تاریخ نگاروں کا یہ وتیرہ ہے کہ وہ کسی فرد یا واقعہ سے متعلق ایک مفروضہ قائم کر لیتے ہیں اور واقعات و دستاویزات کو توڑ مروڑ کر اس مفروضہ کی حقیقت پر دلائل قائم کرتے ہیں، وہ کبھی نتیجہ کو سبب اور کبھی سبب کو نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اس طرح واقعات مابعد کو حادثات ماضیہ کی علت کہہ کر اپنا بیانیہ مرتب کرتے ہیں اور کبھی مجہول روایتوں کو عمداً درست و صحیح ثابت کرکے اپنے دل پسند نتائج اخذ کرتے ہیں یہ طریقے جنہیں وہ Research Method کہتے ہیں، دراصل سوفسطائی ہیں اور ان پر اپنے بیان کی بلند وبالا عمارات کی تعمیر "بناء الفاسد علی الفاسد" کے مصداق ہے"۔۱۱

اسی تسلسل میں وہ کہتے ہیں:

> "یہ شرق شناسوں کی دسیسہ کاری عام قاری کو فریب دینے کی ایک سعی نامشکور ہوتی ہے اور اس سے علم نافع کے بجائے جہل قاطع کو فروغ حاصل ہوتا ہے بالعموم مستشرقین اس اسلوب کو ہماری تاریخ و ثقافت کے بیان میں اختیار کرتے ہیں اور اپنی مزعومہ غیر جانب داری کے پردے میں تعصب و عداوت کو ہوا دیتے اور اسلام کی بیخ کنی کرنے میں منہمک رہتے ہیں۔ ان کا یہ مذہبی عناد، علمی فساد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور اغیار ہی نہیں ہمارے ناواقف افراد بھی اس کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ یہ جعل و دجل مذہبی اختلاف رکھنے والے "اہل مشرق" کے ہاں بہت مقبول ہے یہ لوگ وضعی وجعلی روایتوں اور الحاقی کتابوں کے حوالوں سے اپنے بیانات کو مزید موثق بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یوں تاریخ جعل و دجل کا پشتارہ بن کر رہ جاتی ہے اور قاری کے لئے حق کو باطل سے اور ثمین کو غث سے تمیز کرنا ممکن نہیں رہتا۔ تاریخ مناظرانہ جدلیات کا ایک حصہ بن جاتی ہے"۔۱۲

محسن صاحب مستشرقین کی کتابوں کے بارے میں لکھتے ہیں "وہ بنیادی مآخذ نہیں ہیں اور ان کی ثقاہت محل نظر ہے"۔۱۳ ایک جرمن مستشرق جے ولہاوزن جس کی کتاب کا محسن صاحب نے اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے اسے ایک جگہ "فاضل شرق شناس" کہتے ہیں۱۴ لیکن ساتھ ہی لکھتے ہیں:

> "فاضل مستشرق کا اسلوب نگارش یہ ہے کہ کسی واقعہ سے متعلق مختلف روایتوں کی چھان پھٹک کرکے وہ بیانیہ کی توثیق کرتا ہے مگر وہ مورخانہ دقت نظر سے کام نہیں لیتا اور نہ روایات و رواۃ کی جرح و تعدیل میں الجھتا ہے غالباً اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے خواجہ تاش شرق شناسوں کی طرح پہلے سے ایک موقف متعین کر لیتا ہے اور اس کی توثیق و تحقیق کی خاطر رواۃ و روایات سے بحث کرتا ہے۔ یہ رجحان بڑا خطرناک ہے"۔۱۵

واقعات کے بیان میں جو زبان وہ اپناتے ہیں وہ مورخانہ ہے، کیونکہ تاریخ کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنی زبان ہوتی ہے اور مناظرہ کی اپنی، ہمارے یہاں بالعموم تاریخ میں مناظرانہ روش اختیار کی جاتی ہے اور اثبات حقائق میں جدلیاتی اسلوب سے کام لیا جاتا ہے۔ علی محسن کی زبان سنجیدہ، علمی اور باوقار ہے، عربی تراکیب کے استعمال نے اردو داں طبقہ کے لئے کہیں کہیں، اسلوب کو بوجھل بنادیا ہے لیکن ایسا ہر جگہ نہیں ہے۔

علی محسن صدیقی کی تصانیف میں طبع زاد اور تراجم دونوں شامل ہیں۔ تراجم میں آپ کا مخصوص میدان عقائد ہے، آپ نے عقائد کی جن اہم کتابوں کا مکمل اردو ترجمہ کیا ان میں رازی کی کتاب عقائد مسلمین ومشرکین، شہرستانی کی الملل والنحل، عبدالقاہر بغدادی کی الفرق بین الفرق، عطا ملک جوینی کی تاریخ جہاں کشائی (تاریخ اسماعیلیہ)، جے ولہاوزن کی عہد اموی کے سیاسی و مذہبی احزاب (شیعہ وخوارج) وغیرہ شامل ہیں۔ یوں علی محسن کی کتاب المعارف کو چھوڑ کر ترجمہ کی ہر کتاب کا تعلق کتب اے عقائد سے بنتا ہے۔ عقائد کی تشکیل کے تاریخی پہلو ان کا خاص میدان تخصص ہے۔ ان انتہائی اہم ترین کتابوں کے تراجم نے تحقیق کے بہت سے افق واضح کردیئے ہیں، ذیل میں ان کتابوں کا مختصراً جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

کتاب المعارف:

ابومحمد عبداللہ بن مسلم ابن قتیبہ الدینوری (م ۸۸۹ء) کی مشہور زمانہ تالیف ''کتاب المعارف'' کا پہلا مستند اردو ترجمہ علی محسن صدیقی صاحب نے کیا، یہ کتاب ادارۂ قرطاس کی طرف سے ۱۹۹۹ء میں پہلی بار طبع ہوئی، اس کا دوسرا ایڈیشن رواں سال متوقع ہے۔ علمی حلقوں میں یہ بحث ہوتی رہی ہے کہ المعارف کو تاریخ کی کتاب سمجھا جائے یا ادب کی۔ خود ابن قتیبہ عربی ادب کے اساطین میں شمار ہوتے تھے، ابن خلدون (م ۱۴۰۶ء) نے ابن قتیبہ کو عربی زبان کے چار عظیم انشاء پردازوں میں شمار کیا ہے، دیگر تین انشاء پردازوں میں جاحظ، مبرد اور قالی ہیں۔ خود مصنف کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ وہ مورخ ہیں نہ ہی مترجم کو اس پر اصرار ہے۔ غالباً حاجی خلیفہ (م ۱۶۵۷ء) نے سب سے پہلے اس کتاب کو ''المعارف فی التاریخ'' لکھا اور پھر یہ توضیح دوسرے تذکرہ نگاروں نے اپنائی۔ ڈاکٹر انیس احمد کہتے ہیں ''المعارف، انساب اور تذکرہ

کی نوعیت کی کاوش ہے اور اسی حوالے سے اس کی پہچان ہونی چاہئے''۔ ۱۱

شائد یہ کہنا بجا ہوگا کہ المعارف اپنے زمانے کی علمی و ثقافتی روایت کے پیش نظر تالیف کی گئی۔ وہ علمی سرگرمی یا علمی تحریک جو عہد رسالت سے شروع ہوئی، عباسی عہد میں اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی، عباسی عہد ذہنی و فکری سرگرمیوں کے لئے دوسرے ادوار سے نمایاں اور ممتاز ہے، ابن قتیبہ تیسری صدی ہجری رنویں صدی عیسوی کے بغداد سے تعلق رکھتے ہیں، یہ دور علوم اسلامیہ کا تدوینی دور تھا، حدیث، تفسیر، تاریخ اور ادب کی امہات الکتب مدون ہو رہی تھیں۔ علمی مجالس میں ادبی، علمی اور تاریخی بحثیں عروج پر تھیں۔ لوگ معلومات سے لیس رہنا چاہتے تھے تاکہ علمی مجالس میں خفت وشرمندگی سے محفوظ رہا جاسکے، لہٰذا ڈاکٹر نثار احمد کا یہ کہنا درست ہے کہ ''اس اعتبار سے یہ 'مختلف معلومات' کا خزینہ ہے جسے ''مجلسی ضرورت'' کے تحت قلمبند کیا گیا ہے''۔ ۱۲ زیر نظر عہد میں اس طرز کی اور بھی کتابیں لکھی گئی تھیں جن میں اہم ''کتاب المحبر'' ہے، جس کے مؤلف محمد بن حبیب بغدادی (م ۲۴۵ھ) ہیں۔ ۱۳

کتاب المعارف کا پہلا نامکمل ترجمہ ''تاریخ الانساب'' کے نام سے سلام اللہ صدیقی صاحب نے کیا تھا، جو پاک اکیڈمی کراچی سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا تھا۔ ترجمہ اچھا لیکن نامکمل تھا یعنی تقریباً نصف کتاب کا۔ مکمل کتاب کے ترجمے کا سہرا علی محسن صدیقی صاحب ہی کے سر بندھتا ہے ترجمہ کے ساتھ ہی علی محسن صاحب نے انتقاد کا فریضہ بھی انجام دیا ہے۔ علی محسن صاحب نے اپنے طے کردہ نہج ترجمہ کے مطابق عربی متن کے قریب رہنے کی کوشش کی ہے۔ علوم کی کتاب کا ترجمہ آسان جبکہ ادب وفلسفہ کی کتابوں کا ترجمہ دشوار تر ہوتا ہے۔ عربی ادب میں ایجاز کو بڑی صفت مانا گیا ہے، معارف میں بھی بعض مقامات پر بہت زیادہ ایجاز و اختصار سے کام لیا گیا ہے، لہٰذا اس کا ترجمہ آسان نہیں تھا۔ بعض مقامات پر مترجم کو اصل عبارت پر اضافہ کرنا پڑا ہے۔ تاہم اپنے اضافوں کو بین القوسین رکھا گیا ہے۔ اور یوں مصنف اور مترجم کی عبارتوں کا فرق قائم رکھا گیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تاریخ اسماعیلیہ:

طباعت کے اعتبار سے علی محسن صاحب کی ترجمہ کردہ دوسری کتاب جو ۲۰۰۰ء میں منظر عام پر آئی، تاریخ اسماعیلیہ ہے۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۷ء میں منظر عام پر آیا۔ عطا ملک جوینی (م ۱۲۸۳ء) کی مشہور فارسی تصنیف 'تاریخ جہاں کشائی' منگولوں، خوارزم شاہوں، اور اسماعیلیوں کے حالات کے مستند و تاریخی مآخذ کی حیثیت سے محتاج تعارف نہیں۔ یہ کتاب اپنے وقت تصنیف سے آج تک مورخین اور محققین میں متداول رہی۔ کتاب کا تیسرا اور آخری حصہ اسماعیلیوں کے حالات سے خاص ہے، جوینی کا تعلق بھی اسماعیلیوں کے عہد آخر سے ہے، اس لئے جوینی ان تمام تاریخی حالات و واقعات کا عینی شاہد تھا۔ اس کتاب کا ایک اعلیٰ نسخہ ۱۹۳۷ء میں ہالینڈ سے طبع ہوا تھا، اسی ایڈیشن کے حصہ سوم کا ترجمہ 'تاریخ اسماعیلیہ' کے نام سے علی محسن صدیقی نے پیش کرکے بجا طور پر ایک بڑی علمی ضرورت کو پورا کیا ہے۔۱۰

جہاں کشائی کے اسلوب نگارش کے بارے میں یہ مسلم ہے کہ وہ تیرھویں صدی عیسوی کی اس نثر نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے جو صنائع و بدائع اور عبارت آرائی سے ممتاز ہے۔ عطاء ملک ایران کے قدیم اور ممتاز خاندان سے تعلق اور دربار میں اعلیٰ مناصب اور صاحب دیوان کی نسبتوں سے سرفراز اور علم وفضل میں یگانہ تھا۔ اس کی یہ تاریخ اس کے علم وفضل اور نثر و انشاء کی بہترین مثال ہے، اس مرصع تحریر کا ترجمہ آسان کام نہیں۱۱ ترجمہ سے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ان کی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب کے حوالے سے محسن صاحب کی اہم علمی خدمت یہ سامنے آتی ہے کہ انھوں نے جہاں کشائی کے متن پر حواشی کا اہتمام کیا ہے، یہ گراں قدر حواشی صرف متن کتاب ہی کو نہیں بلکہ اس دور کی تاریخ کو سمجھنے میں بھی معاون ہیں۔

الملل والنحل:

ترتیب طباعت کے اعتبار سے علی محسن صدیقی کا تیسرا ترجمہ جو ادارۂ قرطاس کے توسط سے منظر عام پر آیا، وہ امام شہرستانی (م ۵۴۸ھ) کی مشہور ومعروف کتاب الملل والنحل

کا ترجمہ تھا، اس کتاب کا بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا تھا تاہم اردو کے قالب میں پہلے پہل علی محسن صدیقی ہی نے ڈھالا اور قرطاس کے توسط سے یہ کتاب ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی، اس کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۶ء میں اور تیسرا ایڈیشن ۱۰۰۰ کی تعداد میں ۲۰۱۰ء میں منظر عام پر آیا۔ تاہم اس کے بارے میں شاہ مصباح الدین شکیل صاحب نے یہ لکھا تھا کہ غالباً اس کتاب کا ایک ترجمہ لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔۱۲

کتاب کے آغاز میں علی محسن کا عالمانہ مقدمہ ہے، صدیقی صاحب نے مقدمہ نگاری میں عرب خصوصاً مصری مورخین کے طرز کی پیروی کی ہے جس میں مقدمہ کتاب تین واضح حصوں میں تقسیم ہوتا ہے، (الف) عصر المولف، (ب) حیاۃ مولف، (ج) تالیف۔ علی محسن نے بیشتر مقدمات اسی نہج پر لکھے ہیں، یوں یہ مقدمات قارئین کے لئے استفادۂ مزید کا سبب بن جاتے ہیں۔ عقائد کی کتابوں کا ترجمہ آسان نہیں ہوتا اس حوالے سے محسن صاحب کا میدان تخصص دشوار تر تھا، تراجم میں ان کا اسلوب علمی، زبان شائستہ اور ترجمہ متوازن ہے۔

عہد اموی میں سیاسی و مذہبی احزاب:

چوتھا ترجمہ جو سامنے آیا وہ جرمن مستشرق جولیس ولہاوزن۱۳ کی جرمنی زبان میں لکھی گئی کتاب Die Religus-Poltischen Opposition Im Alten Islam کا اردو ترجمہ ہے، اس کتاب کے عربی اور انگریزی تراجم ہو چکے تھے، اس کا انگریزی ترجمہ پروفیسر آئی، ایم ویلی ڈس نے کیا جبکہ اس کا عربی ترجمہ مصر کے مشہور فاضل عبدالرحمٰن بدوی نے کیا اور وہ قاہرہ سے ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ ولہاوزن کی اس کتاب کے دو حصے ہیں، پہلا حصہ خوارج سے جب کہ دوسرا حصہ شیعہ سے متعلق ہے۔ پہلے محسن صاحب نے کتاب کے دوسرے حصے کا ترجمہ عہد اموی میں سیاسی و مذہبی احزاب کے عنوان سے کیا جو قرطاس کی طرف سے جون ۲۰۰۶ء میں پہلی بار اور جنوری ۲۰۰۷ء میں دوسری بار طبع ہوا۔ جبکہ اس کتاب کے پہلے حصے کا ترجمہ 'الخوارج' کے نام سے صدیقی صاحب نے بعد میں کیا جو ادارہ قرطاس کے زیر اہتمام پہلی بار ۲۰۰۹ء میں طبع ہوا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ولہاوزن کی کتاب کا ترجمہ چنداں آسان نہیں تھا، ولہاوزن نے اپنے اس مقالے کی بنیاد طبری پر رکھی ہے، جبکہ طبری نے طریق جمع الروایات پر عمل کرتے ہوئے ہر قسم کی روایات جمع کردی ہیں۔ طبری کی جمع کردہ روایات میں تحقیق، ترتیب اور تمحیص بڑا مشکل کام ہے، ولہاوزن نے اس کار دشوار کو سر کیا ہے، مترجم نے ولہاوزن کے متعلقہ بیانات کی تاریخ طبری سے مراجعت کی اور اگر کہیں مترجم نے یہ سمجھا کہ ولہاوزن سے طبری کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے تو اس کی تصحیح مترجم نے کردی ہے اور ایسا کئی مقامات پر ہوا ہے۔

اس کتاب میں باب اول ''قتل حجر بن عدی'' کا ترجمہ علی محسن صاحب نے ۱۹۶۸ء میں کیا تھا اور وہ رسالہ برہان دہلی کے شمارہ جنوری ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں محسن صاحب نے ولہاوزن کی تصحیح و تعدیل کے علاوہ طویل اختلافی حواشی لکھے ہیں۔ بقیہ ابواب کا ترجمہ ربع صدی کے بعد ہوا لہٰذا محسن صاحب نے جو منہج ترجمہ باقی کتاب کے لئے اختیار کیا اور اس کا تذکرہ انھوں نے اپنے مقدمہ (ص ۹) میں کیا ہے، حجر بن عدی کا وہ منہج نہیں ہے۔ محسن صاحب نے متن کتاب میں حواشی کا اضافہ کیا ہے، بلکہ انگریزی کے بعض ضروری حواشی کا ترجمہ کرکے شامل کتاب کیا گیا ہے۔

ولہاوزن نے طبری کے لائیڈن ایڈیشن کے حوالے دیئے ہیں۔ یہ ایڈیشن اب نایاب ہے۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں دارالمعارف مصر سے طبری کا ایک نہایت محقق ایڈیشن شائع ہوا ہے، محسن صاحب نے حوالوں میں لائیڈن ایڈیشن کے متوازی مصری ایڈیشن کا ایزاد کردیا ہے، یوں اہل علم حضرات کے لئے دونوں ہی ایڈیشنوں سے مراجعت آسان ہوگئی ہے۔ ولہاوزن کی اسی کتاب کے پہلے حصے کا ترجمہ 'الخوارج' کے نام سے ۲۰۰۹ء سے منظر عام پر آیا۔ یہ کتاب بھی حسب سابق ادارۂ قرطاس نے شائع کی۔

عقائد مسلمین ومشرکین:

مندرجہ بالا وقیع وضخیم کتابوں کے تراجم کے علاوہ علی محسن نے امام فخرالدین رازی کی عقائد و مسلمین ومشرکین کا ترجمہ بھی کیا یہ ترجمہ پہلی بار ۱۹۷۵ء میں علمی کتاب گھر، کراچی نے شائع کیا۔ یہ امام رازی کا مختصر رسالہ تھا۔ متن ترجمہ میں حواشی کا ایزاد محسن صاحب کا بہت بڑا کام ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ رسالہ کی ضخامت ۳۳ صفحات ہے کہ جبکہ سات صفحات کا مقدمۂ مترجم اور ۶۶ صفحات کے حواشی ہیں۔ گویا مترجم نے مصنف سے دوگنا مواد قاری کے لئے فراہم کیا ہے۔ ان سینکڑوں حواشی کی قدروقیمت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ان کی وجہ سے تفہیم متن آسان ہوجاتی ہے۔

الفرق بین الفرق:

عقائد کے حوالے سے آخری کتاب جس کا علی محسن صدیقی نے اردو میں ترجمہ کیا وہ عبدالقاہر بغدادی (م ۴۲۹ھ) کی مشہور زمانہ کتاب الفرق بین الفرق تھی، جسے قرطاس کی طرف سے ۲۰۰۵ء میں شائع کیا گیا، دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۸ء میں اور تیسرا ایڈیشن رواں سال کے اواخر تک متوقع ہے۔ یہ کتاب تاریخ و عقائد مذاہب کے موضوع پر ایک نہایت مستند کلاسیکی دستاویز ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے مختلف فرقوں کے عقائد و افکار کا صرف ذکر ہی نہیں کیا ہے بلکہ ان پر نقد وجرح بھی کی ہے۔ مترجم نے بھی حسب سابق مقدمہ و حواشی کا اہتمام کرکے کتاب کی افادیت میں اضافہ کیا ہے، گوکہ ان کے بعض نکات سے بعض اہل علم نے اتفاق نہیں کیا مثلاً عبدالرشید رحمت صاحب کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے بعض اختلافی نکات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''الفرق بین الفرق'' کے موضوع پر جناب مترجم کا وسیع مطالعہ ہے، جس کا بھرپور اظہار حواشی میں ہوا ہے، تاہم ان کی بعض آراء سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے، مثال کے طور پر انہوں نے ''مقدمہ'' (صفحات ۲۱-۳۵) میں لکھا ہے: ''گروہ متکلمین عرب جس نے۔۔۔ اسلام میں عقل کے کردار پر پرزور مقالے تحریر کیے اور دین کو عربوں کے توہمات اور عجمیوں کی خرافات سے پاک کیا، ان معتزلی علماء پر مشتمل تھا جس کے سید الطائفہ واصل بن عطاء، الغزالی اور عمرو بن عبید تھے''۔ (ص ۲۵)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا امام غزالی (م ۵۰۵ھ) کو معتزلی قرار دینا درست ہے؟ مولانا شبلی نعمانی نے انہیں اشاعرہ سے ہٹ کر متکلم وصوفی لکھا ہے، مگر معتزلی نہیں لکھا۔

اسی طرح جناب مترجم نے عبدالقاہر بغدادی کے بارے میں لکھا ہے:

"ہمارے مصنف تمام عمر تصنیف وتدریس میں مشغول رہے اور طلبہ کی کھلے ہاتھوں سے مالی دست گیری کرتے رہے، وہ علم فروع، یعنی فقہ و فرائض میں اور علم اصول، یعنی علم کلام میں مہارت تامہ رکھتے تھے، انہیں "الاصولی" بھی کہا جاتا ہے" (ص۳۰)۔ "علم اصول" کو "علم کلام" قرار دینا درست نہیں۔ اصولی، فن اصول فقہ کے ماہر کو کہا جاتا ہے نہ کہ علم کلام کے ماہر کو۔ ۳۲

یوں علی محسن صدیقی کی طبع زاد کتب ہوں یا تراجم، علمی حلقوں میں نہ صرف ان کی پذیرائی ہوئی بلکہ سوالات اٹھائے گئے، جوابات کی تلاش نے علمی سرگرمی میں اضافہ کیا۔ علی محسن صاحب نے عربی ادب کے مشہور قصیدہ بردہ اور قصیدہ بانت سعاد کے ترجمہ وشروح بھی لکھیں جو عربی ادب کے طلباء وطالبات کے لیے معاون ثابت ہوئیں۔

محسن صاحب کی طبع زاد تصانیف میں 'الصدیق' (۲۰۰۲ء)، 'تاریخ سلاطین تغلق' (۲۰۰۲ء)، 'عہد فاروقی کے باکمال' شامل ہیں، ان کے مقالات کے دو مجموعے 'مقالات تاریخی' (۲۰۰۲ء) اور 'مضامین تاریخی' (۲۰۰۶ء) شائع ہوچکے ہیں جن میں ان کے ۳۳ مقالات اکٹھے کیئے گئے ہیں۔ ان کی مقدمہ نگاری بھی اہم ہے، اس معاملہ میں وہ مصری مورخین ومرتبین کے طرز کی پیروی کرتے تھے، ان کے سات مقدمات کا مجموعہ 'مقدمات تاریخی' (۲۰۰۶ء) بھی ادارہ قرطاس شائع کر چکا ہے۔

نومبر ۲۰۰۹ء میں جب علی محسن صاحب کی رفیقۂ حیات سیدہ صدیق فاطمہ بیگم کا

انتقال ہوگیا، جن سے علی محسن صاحب کی رفاقت کا سلسلہ پچپن سال سے زائد عرصہ پر محیط تھا اور جن کی رفاقت علی محسن صاحب کو اپنے علمی مشاغل جاری رکھنے کا حوصلہ دیتی تھی، ان کے انتقال کے بعد علی محسن چودہ ماہ حیات رہے اور زیادہ تر علیل رہے۔ ان کا لکھنا پڑھنا بہت کم ہوگیا تھا۔ وہ ۲۰۰۹ء سے تین کتابوں پر کام کر رہے تھے۔ ایک سیرۃ الرسول اللہ، دوسرے سوانح حضرت عمر فاروق اور تیسرے سوانح حضرت علی، انہوں نے تینوں کتابوں کا غالب حصہ تحریر کرلیا تھا لیکن تکمیل کی مہلت اجل نے نہ دی۔

زندگی جن کے تصور سے جلا پاتی تھی
ہائے کیا لوگ تھے جو دام اجل میں آئے — ناصر کاظمی

علی محسن صدیقی صاحب کی ابتدائی چند کتابوں کے علاوہ ان کی بیشتر کتب ادارہ قرطاس سے طبع ہوکر علمی حلقوں تک پہنچیں۔ میرے ذہن میں ایک اشاعتی ادارہ کے قیام کا منصوبہ تو عرصہ سے تھا لیکن اس کو عملی شکل دینے میں ۱۹۹۱ء میں علی محسن صدیقی کے گھر پر ہونے والی ایک ملاقات نے مہمیز کا کام کیا۔ مجھے یاد پڑتا ہے اس ملاقات میں مجاہد صاحب (مرحوم) بھی موجود تھے، گفتگو مختلف موضوعات پر ہورہی تھی، جس کے دوران مجھے اندازہ ہوا کہ محسن صاحب کی کئی کتابیں تیار ہیں لیکن وہ کسی بھی پبلشر سے خوش نہیں، اور کسی کو بھی یہ کتابیں دینے کے لئے تیار نہیں۔ اس وقت میں نے سر سے کہا کہ میرا ایک اشاعتی ادارہ ہے آپ اپنی کتاب مجھے دیں۔ مجھے یہ جھوٹ اس لئے نہیں لگا کہ اشاعتی ادارہ میرے دماغ میں محفوظ و موجود تھا، جسے کسی بھی کتاب کی طباعت سے عملی شکل دی جاسکتی تھی۔ بڑے کاموں کے لئے ہوم ورک کی ضرورت ہوتی ہے، غیر ملکی فتح ہے، مشاورتیں ہوتی ہیں، جگہ کا انتخاب، سرمائے کی فراہمی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن قرطاس ایک "جملے" سے قائم ہوگیا۔ سر نے اپنی عادت کے مطابق جب میرے اشاعتی ادارے (جس کا نام قرطاس یا قرالیس میں نے سوچ رکھا تھا) کے بارے میں مجھ سے تحقیقات کیں تو انہیں اس کے 'کاغذی' ہونے کا اندازہ ہوگیا، اس کے باوجود مجھے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں معلوم مجھ پر کیوں اعتماد کا مظاہرہ کرتے ہوئے انھوں نے ''کتاب المعارف'' کا مسودہ مجھے تھمادیا۔ میں نے گھر آکر اپنے شوہر سجاد ظہیر (مرحوم) کو بتلایا، ان کا پہلا سوال یہ تھا کہ کتاب کی اشاعت کے لئے سرمایہ کہاں سے آئے گا، ایک معصوم سی غیر بلغی میرے دماغ میں موجود تھی، میں نے کہا اپنے پراوڈنٹ فنڈ کے مقابل قرضہ لوں گی۔ ایک لاکھ کا قرضہ لیا گیا۔ کتاب المعارف شائع ہوگئی، اور کسی بھی مارکیٹ اسٹریجی کے بغیر اسی سال فروخت ہوکر ختم ہوگئی۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ ہمارے یہاں لوگ جو کچھ پڑھنا چاہتے ہیں وہ ان کو نہیں ملتا اور اگر ملے تو ہر حال میں حاصل کرتے ہیں۔ اس کے بعد تواتر سے قرطاس نے علی محسن صاحب کی آٹھ کتابیں شائع کیں۔ آج قرطاس کے قیام کو تیرہ سال گزر چکے ہیں اور وہ تاریخ، ادب اور علوم اسلامیہ کے موضوعات پر نوے کتابیں شائع کرکے اشاعتی اداروں میں اپنا ایک مقام بنا چکا ہے۔ آج کل اس ادارہ کے نگراں سعود ظہیر ہیں اور اس کا دفتر یونی ورسٹی روڈ پر ہے۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہترے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں

محسن صاحب میں شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق تھا، وہ شاعر بھی تھے، عربی اور فارسی میں کم جبکہ اردو میں بیشتر شعر کہتے تھے، ان کا ایک شعری مجموعہ تیار تھا جو تا حال زیور طباعت سے آراستہ نہ ہوسکا۔

محسن صاحب مجھے افسانہ نگاری و شاعری سے دور رکھنا چاہتے تھے، ان کا کہنا تھا علمی تحقیقات کی طرف توجہ دو، اسلامی تاریخ کے حوالے سے کرنے کے بہت کام ابھی باقی ہیں۔ تمہاری شناخت ایک محقق کے طور پر ہونی چاہئے، افسانہ نگار اور شاعرہ کے طور پر نہیں اور پھر میں ایک سعادتمند شاگرد کی طرح ان کی نصیحت گرہ میں باندھ لی۔ موزونی طبع کے بموجب کبھی کوئی افسانہ لکھ لیا جائے تو الگ بات ورنہ شعر و افسانہ کی طرف خصوصی توجہ ختم کردی اور تحقیق کی راہ پر وخار پر ننگے پاؤں سفر کا آغاز کردیا۔ محسن صاحب پر ابھی بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے

لیکن ان پر اپنے اس پہلے (آخری نہیں) مضمون کا خاتمہ ان کی ایک خوبصورت غزل پر کرتی ہوں، جو انہوں نے مجھے اپنے قلم سے ۱۹۹۲ء میں لکھ کر بھیجی تھی، مجھے معلوم نہیں یہ کہیں سے طبع ہوئی یا تا حال غیر مطبوعہ ہے۔

وہی چمن ہے ، وہی گل ہیں ، آب جو بھی وہی
وہی ہے ساقی مہ وش ، مے و سبو بھی وہی
وہی ہے بزم حریفان بادہ پیما بھی
ہے میکدہ بھی وہی ، شور ہائے وہو بھی وہی
مگر نہ بزم میں ، میں ہوں ، نہ تو ہی اے ہمدم
کہ میں قتیل حوادث ہوں اور تو بھی وہی
ہم ایسے تشنہ لبوں کو تو ذرہ بھی نہ ملی
نصیب بوالہوساں، بادہ و سبو بھی وہی
بہت ہی خوار ہیں، آداب مے کشی کے اسیر
ہر ایک جرعہ پہ بہکے جو، سرخ رو بھی وہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حواشی و حوالہ جات

۱۔ علی محسن صدیقی صاحب کا انتقال ۱۴ رجنوری ۲۰۱۰ء کو ہوا۔ تدفین ۱۵ رجنوری کو یٰسین آباد قبرستان میں ہوئی۔

۲۔ قلمی شذرہ از علی محسن صدیقی، مخزونہ نگار سجاد ظہیر۔

۳۔ صدیقی صاحب لکھتے ہیں "ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر اور میرے ایک اور شاگرد محمد شکیل صدیقی (اسسٹنٹ پروفیسر اسلامی تاریخ، کراچی یونیورسٹی) کا یونیورسٹی میں بحیثیت استاد تقرر ایک خوش آئند عمل ہے اور بجا طور سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ان دونوں کی علمی لیاقت و ذہنی صلاحیت کی بدولت شعبہ ترقی کرے گا اور اپنی علمی شان کو نہ صرف برقرار رکھے گا، بلکہ اسے مزید تابناک بنائے گا۔ آمین"
(الصدیق، ص ۳۴)

۴۔ علی محسن صدیقی، عہد اموی میں سیاسی و مذہبی احزاب، مقدمہ، ص ۸ ۔ ۹، قرطاس، کراچی، ۲۰۰۹ء

۵۔ ایضاً، ص ۹

۶۔ الصدیق، مقدمہ، ص ۱۸

۷۔ الصدیق، مقدمہ، ص ۴۰

۸۔ الصدیق، مقدمہ، ص ۵۰ ۔ ۵۸

۹۔ الصدیق، مقدمہ، ص ۱۵

۱۰۔ الصدیق، مقدمہ، ص ۳۱

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۶

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۹۸

۱۴۔ علی محسن صدیقی، مقدمہ مشمولہ عہد اموی کے سیاسی و مذہبی احزاب، ص ۷

۱۵۔ ایضاً، ص ۸

۱۶۔ ڈاکٹر انیس احمد، تبصرہ بر المعارف، مشمولہ نقطہ نظر، مسلسل شمارہ ۱۴، اپریل ۔ ستمبر ۲۰۰۹ء، پالیسی اسٹڈیز سینٹر، اسلام آباد

۱۷۔ مکتوب ڈاکٹر نثار احمد، بنام نگار سجاد ظہیر، مورخہ ۱۵ اپریل ۱۹۹۹ء، مخزونہ نگار سجاد ظہیر

۱۸۔ کتاب المحبر، تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کے ایک معروف عرب ماہر لسان اور مورخ ابو جعفر محمد ابن حبیب بن امیہ بن عمرو (م ۲۴۵ھ/ ۸۶۰ء) کی تالیف ہے۔ ابن حبیب کی تقریباً پینتالیس تصنیفات میں سے یہ سب سے زیادہ مشہور و معروف کتاب ہے۔ جس کا واحد مخطوطہ برٹش میوزیم (لندن) میں محفوظ ہے اور جسے ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے بڑی محنت سے ایڈٹ کیا اور یہ کتابی شکل میں پہلی بار دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد دکن سے ۱۳۶۱ھ/۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب عرب جاہلیہ اور اسلام کی ابتدائی صدیوں کی سماجی و ثقافتی تاریخ ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر کی نظر ثانی کے بعد پہلی بار ادارہ قرطاس سے ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔

۱۹۔ "تاریخ جہاں گشائی" کے مصنف علاء الدین عطا ملک الجوینی اور ان کے بھائی شمس الدین کو منگول دربار میں خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ الجوینی ان چند مسلمان مدبروں میں سے تھے جنھوں نے خلافت بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے والے منگولوں کی صفوں کے اندر رہ کر اپنے اثر و رسوخ کو حتی الامکان مسلمانوں اور اسلام کے تحفظ کے لیے استعمال کیا۔ وہ دور مسلمانوں کے لیے سخت ابتلاء اور آزمائش کا دور تھا، تاہم منگول رفتہ رفتہ اسلامی تعلیمات سے روشناس ہوئے، اور بالآخر ان کا رہنما تکودار ۱۲۸۲ء اور ۱۲۸۴ء کے درمیان حلقہ اسلام میں داخل ہوا، اور احمد کے نام سے معروف ہوا۔ ۱۲۵۶ء میں جب ہلاکو خان قزوین کے شمال مشرق میں واقع البرز کے سلسلہ کوہ کے دشوار گزار علاقے میں اسماعیلی مرکز الموت پر حملہ آور ہوا تو عطا ملک الجوینی اس کے ہمراہ تھا، اور جب اسماعیلی حاکم، ملک الجبال رکن الدین خورشاہ نے ہلاکو خان کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تو ایک فریق کی شکست اور دوسرے کی فتح کی دستاویز "فتح نامہ" الجوینی نے ہی تحریر کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ جوینی کی مداخلت سے ہلاکو خان اسماعیلیوں کے کتب خانے کو آگ لگانے سے باز رہا تھا، اور اسی کتب خانے سے حاصل کردہ لوازمے سے جوینی نے اسماعیلیوں سے متعلق اپنی تاریخ کا حصہ مرتب کیا تھا۔

۲۰۔ مطبوعات جدیدہ، مشمولہ معارف، اعظم گڑھ، ستمبر ۲۰۰۹ء، ص ۲۳۷

۲۱۔ مکتوب، شاہ مصباح الدین شکیل، بنام نگار سجاد ظہیر، مورخہ ۲۵ جولائی ۲۰۰۹ء، خط میں شاہ صاحب لکھتے ہیں: قرطاس کی تازہ اشاعت "الملل والنحل" پر مبارکباد قبول کیجیے۔ فرائیڈے اسپیشل ۱۸ جولائی ۲۰۰۹ء میں پروفیسر محمد شکیل صدیقی کا تبصرہ بھی موصول ہے۔ پروفیسر صاحب نے لکھا ہے کہ "اردو زبان میں کتاب الملل والنحل کا پہلی بار ترجمہ برصغیر پاک و ہند کے معروف اسکالر۔۔۔ پروفیسر علی محسن صدیقی نے کیا ہے"۔ یہ بیان شاید درست نہیں۔ مجھے خیال پڑتا ہے کہ لاہور سے تین جلدوں میں شہرستانی کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ کس نے کیا یاد نہیں"۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۴۲ مستشرق ہے ولہاوزن جرمنی کے شہر ہیملن (Hem len) میں ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوا۔ اس نے بطور خاص سامی زبانوں کی تحصیل پر توجہ دی، عربی اور عبرانی میں مہارت حاصل کی۔ اس کی ساری عمر تصنیف و تالیف میں گزری۔ ولہاوزن نے واقدی کی کتاب المغازی کا جرمن ترجمہ کیا تھا (۱۸۸۲ء)۔ ابن الکلبی کی کتاب الاصنام مرتب کی تھی (۱۸۸۷ء)۔ اسلام کی قدیم ترین تاریخ (۱۸۹۹ء) برلن سے شائع ہوئی۔ ولہاوزن نے اس کتاب میں خلفاء راشدین کے عہد کی تاریخ کو اپنا موضوع بنایا ہے، یہ کتاب تاحال جرمن زبان سے کسی دوسری زبان میں ترجمہ نہیں ہوئی۔ 'عہد اموی میں سیاسی و مذہبی احزاب۔ الخوارج و الشیعہ' (۱۹۰۱ء) میں برلن سے شائع ہوئی۔ اسلامی تاریخ پر ولہاوزن کی ایک اہم ترین تصنیف 'دولت عربی اور اس کا سقوط' ہے یہ کتاب ۱۹۰۲ء میں برلن سے شائع ہوئی اس کا انگریزی میں ترجمہ مشہور فاضل Graham Weir نے کیا اور ۱۹۲۷ء میں کلکتہ سے طبع ہوا۔ ولہاوزن کی یہ تالیف عہد اموی کی پہلی مستند تاریخ ہے جو کسی مغربی زبان میں لکھی گئی۔ ولہاوزن نے مختلف موضوعات پر جو مختلف مضامین اور مقالات لکھے وہ چھ جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

۴۳ عبدالرشید رحمت، تبصرہ بر الفرق بین الفرق مشمولہ نقطۂ نظر (ص ۵۹)، اکتوبر ۲۰۰۶ء تا مارچ ۲۰۰۷ء، پالیسی اسٹڈیز سینٹر اسلام آباد۔

۴۴ قلمی شذرہ، ''محسن کے۔۔۔'' بخزینہ نگار سجاد ظہیر، مورخہ ۱۳ اکتوبر ۲۰۰۱ء)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

An approach to study Dr. Fazl-ur-Rehman's works

Muzzammila Shafique

ABSTRACT

Dr. Fazl-ur-Rehman (1919-1989) was one of the prominent scholars of twentieth century who were very much concerned with the intellectual status of the Muslim world and a lack of proper understanding of the Quran. He believed that the Quran should be understood as a coherent system but he thought that unfortunately the underlying unity of Quranic text has never been realized fully in the history of Muslims. In addition to this, we see an insistence upon fixing on the words of various verses in isolation. He, therefore, has proposed an adequate hermeneutical method of interpreting the Quran. He has discussed his theory in various works including Islam, Islam and modernity and themes of the Quran etc. Many scholars of present day have attempted to analyze his method of interpreting Quran which he laid down in his works. This article suggests a possible approach with which we could understand his thoughts better. For example, to start such an analysis first we have to find whether such a model was ever given before in the Muslim history. If so, what were the conditions then and why we need to rethink about it now? Secondly, we have to find that if such an ijtihad is done, who will decide its credibility? And which issues are worth taking to begin with? These are certain issues which would be considered and discussed in this article.

© rasailojaraid.com